نئے خاکے

قدوس صہبائی

نئے خاکے

نئے خاکے

قدوس صہبائی

بی اے آنرز

بار اوّل

قیمت ۱۲؍

مکتبۂ ادب اردو بازار جامع مسجد دہلی

جناح پریس دہلی

فہرست

مقدّمہ

(از جناب واقف صاحب صدیقی ایڈیٹر نگار خانہ دہلی)

قدوس صہبائی" اردو ادب کی مشہور شخصیت ہیں۔ اور ترقی پسند فن کاروں کی صف میں اپنی انقلابی ذکاوت۔ ترقی پسندانہ رجحان اور پسندیدہ ادبی و افسانوی صلاحیت کے اعتبار سے ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ آپ کے قلم میں بلا کا زور۔ اور فکر میں غضب کی جدت ہے۔ اور آپ زندگی کے مسائل کو صداقت و خلوص کے رنگ میں اس طرح ادب کے اندر سموتے ہیں کہ آپ کی ہر ادبی تخلیق' براہ راست دلوں اور دماغوں کو اپیل کرتی ہے "نئے خاکے" آپ کے مختصر ترین افسانہ نما سماجی' فکری۔ اور ادبی تنقیدی ادب پاروں کا ایک پسندیدہ نمونہ ہے۔ اس مجموعے میں' جناب قدوس صہبائی نے اپنے فن کو ایک خاص اسلوب و انداز سے پیش کیا ہے۔ یہ مجموعہ ایسے ایسے چھوٹے افسانوی ادب پاروں پر مشتمل ہے جن میں' آسکر وائلڈ کا تخئیل اور ادبی جدت' نئے فن کاروں کی صداقت احساس' روسی ادب کا طنز اور فرانسیسی اہل قلم کا رومانی طرز نگارش پوری قوت سے موجود ہے۔ قدوس صاحب نے زندگی کے بے شمار مسائل اور ان گنت موضوعات کو کامیاب ترین اختصار کے ساتھ (جو ابہام و اجمال سے پاک ہے) پیش کیا ہے۔ بطور مثال ایک افسانہ نما تبصرہ درج ذیل ہے مزدور لیڈر نے سرمایہ دار دوست سے کہا۔

میرے پاس ایک کروڑ روپیہ ہو تو اسے اس بزنس میں لگاؤں۔ اس کارخانے کو خرید لوں۔ فلاں ہل اسٹیشن پر کوٹھی بنواؤں، فلاں موٹر رکھوں۔ دنیا کا سفر......
سرمایہ دار دوست نے بات کاٹ کر کہا۔

یہ ٹھیک ہے تم میرے ہم خیال ہو۔ تم سرمایہ دار ہو۔

چند جملوں میں قدوس صاحب نے سرمایہ دارانہ ذہنیت اور اس کے ذہنی ماحول کی ترجمانی کر دی ہے اور ایسے لطیف طریقے پر کہ..... یہ افسانہ اپنے ہر حرف میں ایک داستان لئے ہوئے ہے۔ اسی قسم کے بیشمار دلچسپ افسانے۔ اس مجموعہ کے اوراق و صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں۔ ان افسانوں کی ٹیکنک، قدوس صاحب کی اپنی ایجاد کردہ ہے۔ اور اردو ادب میں ایک خاص اسٹائل کی بنیاد ڈال رہی ہے۔ قاتل محبت، ساتھی، آنیوالا زمانہ، حقیقت یا افسانہ، بے چارے، تانہ بخشند خدائے بخشندہ، فطرت، خوش نصیبی، غرض یہ ہے کہ بے شمار موضوعات ہیں اور ہر موضوع پر قدوس صہبائی کے قلم نے اپنی جادو نگاری فلسفیانہ افتادِ طبع، عمیق مطالعہ اور زندگی کے ساتھ اپنے گہرے شغف اور خلوص کا ثبوت دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ادب اردو میں قدوس صہبائی کی یہ کوشش نئے زمانے کا سنگِ میل ثابت ہوگی اور ادب اردو آپ کے ترقی پسندانہ افکار سے مستفید ہوتا رہے گا۔

فکر شاعر ہے وقفِ نظمِ جدید
لاکھ بن بن کے لٹ گئے خاکے
بزم شعر و ادب میں پھر قدوس
پیش کرتے ہیں کچھ نئے خاکے

(واقف صدیقی)

مساواتُ

ایک بڑی مچھلی نے چاہا کہ چھوٹی مچھلی کو نگل جائے ——

چھوٹی مچھلی نے احتجاج کیا اور مساوات کا اصول پیش کر کے دعوےٰ کیا کہ بڑی مچھلی کو کوئی ایسا حق نہیں پہنچتا کہ وہ چھوٹی مچھلیوں کو اپنی غذا بنائے

بڑی مچھلی نے کہا "مجھے کسی نہ کسی طرح اپنا پیٹ بھرنا ہے اور میرا پیٹ بڑا پیٹ ہے۔ تم میری غذا ہو۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی کہ مساوات کا اصول زندگی کا صحیح اصول ہے۔ اگر تم مرنا نہیں چاہتی ہو تو مجھے مار ڈالو —— آؤ! مجھے نگل جاؤ —— !"

چھوٹی مچھلی لاجواب ہو گئی۔ مگر وہ ایک کوشش کرنا چاہتی تھی اس نے چاہا کہ بڑی مچھلی کو یا تو وہ نگل لے یا مار ڈالے۔ دونوں کوششیں ناکام ہو گئیں۔ مایوس ہو کر اس نے بڑی مچھلی کو اجازت دیدی کہ وہ اُسے نگل لے —— اور بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل گئی

——

"مساوات زندہ باد"

(سلوگوب کے خیالات سے اخذ کیا گیا)

یکسانیت

خدا نے سوچا کہ زمین پر وہ اپنا نائب بھیجے ــــــــــ

فرشتوں کو اس کی اطلاع ملی۔ انہوں نے مخالفت کی۔ جب مخالفت کارگر نہ ہوئی تو انھوں نے تجویز پیش کی کہ فرشتوں کو ہی یہ منصب ملے ــــــــــ

مگر خدا نے ان کی یہ تجویز بھی نہ مانی اور خاک سے ایک پتلا بنا کر زمین پر اپنا نائب بھیج دیا ــــــــــ

سالار فرشتے نے احتجاج کیا ــــــــــ

ــــــــــ خدا نے اُسے مردود اور شیطان بنا دیا۔

انسان نے پوچھا کہ یہ سب سہی مگر آتشیں مخلوق پر خاکی مخلوق کو ترجیح دینے کا سبب آخر کیا ہے؟

جواب ملا کہ "اطاعت سے گھبرا گیا ہوں۔ آتشیں فرشتے کی سرشت اطاعت ہی اطاعت ہے ــــــــــ یکسانی کسی کو پسند نہیں، اب میں ایک سرکش رعایا کا آرزومند ہوں۔ خاکی انسان میرا نائب بنکر یہ ضرورت پوری کریگا۔ مجھے اور میرے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیگا۔ آتشیں فرشتہ شیطان بنکر بھی مجھے موجود سمجھتا ہے اور میری عظمت کا قائل ہے ــــــــــ اپنی تعریف سنتے سنتے عاجز آ گیا ہوں"۔

شاعر

انقلابیوں کا جلوس "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگاتا لارنس گارڈن کے قریب سے گذر رہا تھا۔ ——————

پولس انسپکٹر نے ایک انقلابی لیڈر کو گرفتار کر لیا۔ اور ہتھکڑی لگا کر لے چلا، سامنے سے تین دوست پریشاں بال، جھومتے جھامتے لڑتے لڑاتے گاتے چلے آرہے تھے ——————

انسپکٹر نے روکا وہ انھیں بھی وضع قطع سے انقلابی سمجھکر گرفتار کرنا چاہتا تھا تینوں میں سے ایک بولا —— "روک رہے ہو" ——

انسپکٹر نے جواب دیا —— "تم باغی ہو —— " پہلا جھجک کر ہٹ گیا۔ دوسرا مردانہ وار آگے بڑھا اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ تھا۔ پولس انسپکٹر نے کاغذ لے لیا پہلی سطر تھی —— ؎

تیرا دیوانہ ہوں، دیوانہ ہوں، دیوانہ ہوں
جسکی دنیا میں نہیں پوچھ وہ فرزانہ ہوں

انسپکٹر نے ہنس کر کاغذ واپس کر دیا اور انقلابی کی ہتھکری کو بجاتا اور مسکراتا یہ کہکر آگے بڑھ گیا۔

"ارے تم تو شاعر ہو اس قسم کے! ——

احساس

بدرُو، بھدّا اور توندیلا جاگیردار باغ کی بارہ دری میں تخت پر گدّے تکیے کے سہارے بیٹھا حقّہ پی رہا تھا......

چند قدم کے فاصلے پر ایک بوڑھی جس کے بدن پر چیتھڑے لپٹے ہوئے تھے —— اور جس کا چہرہ بھوک، بڑھاپے اور شاید موت کی کشمکش کا آئینہ دار تھا پڑی دم توڑ رہی تھی جاگیردار کی نظر پڑی کالو باغبان کو آواز دے کر بلایا گیا۔

"کیوں جی! یہ چڑیل باغ میں کیسے آئی ——"

"مجھے نہیں معلوم ——"

"اچھا اسے نکال دو ——"

"سرکار!"

"جلدی کرو ——"

نوجوان باغبان بڑھا، میلی کچیلی گندہ، غلیظ اور عفونت سے بھرپور عالمِ نزع یا عالمِ گرسنگی میں بیہوش بڑھیا کے پاس پہنچا —— "ارے! یہ تو مر رہی ہے ——"

منہ ہی منہ میں وہ بڑبڑایا۔ پھر خاموش کھڑا ہو گیا جیسے سنگِ سیاہ کا مجسمہ ہو۔

"کیا کر رہا ہے حرامی کالو! نکال نہیں چکتا ——"

کالو نے بوڑھی کو کاندھے پر اٹھا لیا اور باغ سے نکل گیا ـــــــ

رات کو دو بجے کالو کی کوٹھری میں بوڑھیا بستر پر بیٹھی ٹکر ٹکر چاروں طرف دیکھ رہی تھی اور کالو کی بیوی اُس کے سامنے دودھ کا گلاس لئے کھڑی تھی۔

اڈیٹر

ایک مشہور اخبار کا مالک شالامار باغ میں ایک بینچ پر بیٹھا شام کی تازہ ہوا سے لطف اندوز ہو رہا تھا ——————

اس کا سوٹ بہت قیمتی تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ کی انگلی میں ہیرے کی بیش قیمت انگوٹھی پڑی تھی۔ برابر ہی دو تین باتصویر اہنامے رکھے تھے جن میں سے وہ ایسے اشتہارات پر نشان لگا چکا تھا جو اُس کے اخبار میں نہیں تھے ——————

دو دوست لڑتے جھگڑتے بحث کرتے آئے اور کوئی خالی جگہ نہ پا کر مالک اخبار کے برابر بیٹھ گئے۔ ایک کی شیروانی کا کالر میل خوردہ، بوسیدہ بلکہ پھٹ چکا تھا۔ دوسرے کی چپل کا تسمہ ٹوٹا ہوا تھا۔ ایک ننگے سر تھا دوسرے کے پاس شیروانی بھی نہ تھی —————— جھگڑالو دوست بلند آواز اور تحکمانہ لہجے میں بحث کر رہے تھے اُنھیں تیسرے ہم نشین کی موجودگی کی خبر نہ تھی بحث کا انہماک دنیا بھر کی مصروفیتوں سے زیادہ تھا۔

چرچل —————— اسٹالن —————— روزویلٹ۔

آیندہ امن عالم میں کسے طاقت حاصل ہوگی ؟

اخبار کا سرمایہ دار مالک تھوڑی دیر خاموشی سے بحث سنتا رہا پھر مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی۔ وہ گھڑا ہو گیا اور دخل درمعقولات

کر کے بولا ــــــــــــ

"آپ دونوں شاید اڈیٹر ہیں ــــــــ"

اڈیٹر ہکا بکا ہو کر اجنبی کو دیکھنے لگے۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا ــــــــ؟"

"میں نجومی ہوں ــــــــ"

"فضول ــــــــ" دونوں کی زبان سے نکلا۔

اجنبی کی مسکراہٹ قہقہہ میں تبدیل ہو گئی۔

"کل آپ ڈیلی گزٹ کے دفتر میں مجھ سے ملئے۔" اس نے پُر سکون اور باوقار امیرانہ لہجے میں کہا۔

"ڈیلی گزٹ! ــــــــ" دونوں اڈیٹروں کی زبان سے یکساں الفاظ کلماتِ حیرت بن کر نکلے ــــــــ وہ دونوں زیادہ متحیر ہو گئے تھے۔

اجنبی نے حاکمانہ اور مالکانہ اقتدار کے ساتھ حکم دیا ــــــــ

"ہاں! ڈیلی گزٹ، میں اُس کا مالک ہوں۔ میرے اخبار میں ایک جگہ خالی ہے۔ منظور ہو تو دونوں کل آجاؤ۔ امتحان لے کر دونوں میں سے ایک کا انتخاب کر لوں گا ــــــــ"

اخبار کا مالک اجنبی چلا گیا۔ بے روزگار اڈیٹر بحث بند کر کے خاموش گہری سوچ میں پڑ گئے بہت دیر کے بعد ایک بولا۔

"میری معاشی حالت بہت خراب ہے ــــــــ" بہت دیر کے بعد دوسرا بولا۔

"آج صبح میں نے اور بیوی بچّوں نے صرف دلیا کھایا ہے ــــــــ"

دونوں پھر چپ بیٹھ گئے ــــــــ

گُناہ

شراب بندی کی تحریک کا لیڈر بیمار ہوگیا۔ ڈاکٹر نے علاج سے مایوس ہو کر کہا ——— "تم شراب پیو ———"

لیڈر نے کہا ——— "ڈاکٹر! میں اصول کی خلاف ورزی نہیں کرتا ———"

ڈاکٹر نے جواب دیا ——— "تو زندگی سے ہاتھ دھولو ———" ڈاکٹر چلا گیا ——— لیڈر کی بیوی نے شراب کی بوتل سے شراب انڈیل کر لیڈر کو دی۔ ایک سانس میں بغیر سوڈا ملائے وہ چڑھا گیا ——— پھر اور مانگی اور ملی، اور چڑھا گیا، پھر اور مانگی، پھر چڑھا گیا ———

بیوی کو غصہ آگیا اُس لئے جھنجلا کر کہا ——— اب نہیں دیجائیگی۔

"کیوں؟" لیڈر نے پوچھا۔

"بہت ہوگئی" ———

"ہو جانے دو" ———

"ڈاکٹر کے سامنے اتنی پرہیز گاری کی کیا وجہ تھی ———؟"

"میں شراب بندی کا لیڈر ہوں شراب بندی میرا اصولِ زندگی ہے۔ ڈاکٹر سے شراب پینے کا اقرار گناہ تھا ———"

"اور یہ میرے ہاتھ سے پینا گناہ نہیں" ———

"نہیں، گناہ وہ ہے جس سے لوگ واقف ہو جائیں۔"

ادیب کون ہے....؟

"میں اس لئے بھوکا مرتا ہوں کہ ادیب ہوں ——"

"تم اس لئے بھوکے مرتے ہو کہ ادیب نہیں ہو ——"

"تم اس لئے ایسی باتیں کہتے ہو کہ بھوکے نہیں مرتے، فوج کا کوئی کپتان بھوکا نہیں مرتا —— میں ادیب ہوں اس لئے بھوکا مرتا ہوں ——"

"آج کل نہ فوج کا کپتان بھوکا مرتا ہے نہ ادیب! تم ادیب نہیں ہو اس لئے بھوکے مرتے ہو ——"

"جنگ ادب کی قاتل ہے —— میں اس لئے بھوکا مرتا ہوں کہ ادیب ہوں آج کل جنگ ہے ——"

"آج کل جنگ ہے۔ جنگ نے ادیبوں کی بھوک مٹانے کے لئے نوٹ پیدا کر دیئے ہیں ——"

تم ادیب نہیں ہو ——"

"نوٹ! نوٹ ادیب کے لئے نہیں۔ جنگ چلانے کے لئے ہیں، میں اس لئے بھوکا مرتا ہوں کہ ادیب ہوں ——"

"نوٹ! نوٹ جنگ کے لئے ہیں اور ادیب بھی جنگ کے لئے ہیں۔ تمہارے لئے نہ نوٹ ہیں، نہ تم جنگ کے لئے ہو، بھوکے مرتے

ہو کیونکہ ادیب نہیں ہو ——"

میں ادیب نہیں ہوں تو ادیب و شاعر کون ہے ——؟"

"ادیب و شاعر وہ ہے جو نیشنل وار فرنٹ کے جلسوں میں نظمیں پڑھتا ہے۔ جو اخباروں میں جنگ کی حمایت کرتا ہے، جو ریڈیو پر جنگی خبر نامے سناتا ہے۔ جو جنگی فیچر لکھتا ہے، جو ڈھائی سو سے دو ہزار روپے تک کے نوٹ ماہانہ تنخواہ میں پاتا ہے اور جو بھوکا نہیں مرتا۔

"تم ادیب نہیں ہو ——"

فِطرَتؔ

عائشہ بولی کہ تمہارے بغیر میری زندگی دوبھر ہے ——

رشید بولا "میری زندگی کے چمن میں تم شادابی ہو ——"

دونوں لیلےٰ مجنوں تھے —— محبت نے فطرت سے شکست کھائی۔ دونوں کی شادی ہوگئی —— اس کے باوجود بھی وہ محبت کرتے رہے —— محبت کبھی بناوٹی محبت ہوتی کبھی ایک چنگاری عہدِ ماضی کی یادگار محبت کی سرد ہوا سے چمک اٹھتی مگر وہ سمجھتے کہ وہ —— لیلےٰ مجنوں ہیں ——

رشید کو نمونیا ہوگیا —— عائشہ نے سمجھا کہ وہ خود قریب المرگ ہوگئی ہے —— مگر وہ تندرست تھی البتہ اُس کی آنکھیں تین رات دن جاگ کر اداس اور سُرخ ضرور ہوگئی تھیں۔ ان پر ایک افتادگی اور تھکن اور نیند کا بوجھ تھا۔ لیکن وہ یقین رکھتی کہ یہ رشید کی بیماری کا غم ہے ——

اور چوتھے دن اُدھر موذن نے صبح کی اذان دی اُدھر رشید نے دم توڑا —— عائشہ سمجھی کہ اُس کی جان بھی نکل رہی ہے۔ مگر وہ زندہ تھی۔ اور تندرست تھی۔ روتے روتے نڈھال ہوجانا موت تو نہیں ہوتی —— مگر عائشہ نے یہی یقین کیا اور سب کو یقین دلایا کہ وہ رشید

کے بغیر زندہ نہیں رہے گی ——————

بیوہ عائشہ ایک سال تک سوگوار رہی۔ لیلیٰ اکیلی تھی مجنوں کے بغیر زندہ —— مگر تندرست تھی، حسین تھی، اُس کی آنکھوں میں کبھی ایک ہلکا غمگینی کا احساس ہوتا اور کبھی شباب کے سرخ ڈورے دکھائی دیتے —— پھر یہ احساس غمگینی بھی ختم ہو گیا۔ شباب و جوانی، رعنائی زیبائی تبسّم اور شوخی ہی شوخی رہ گئی ——————

اور جاڑوں کی راتوں میں ایک مجنوں سے جدا ہو جانیوالی لیلےٰ برسات کی ایک رات میں دوسرے مجنوں کو پا لینے میں کامیاب ہو گئی داؤد دوسرے شوہر کو بھی وہ مجنوں کہتی تھی ——————

داؤد نے پوچھا " تمہیں رشید کی یاد تو نہیں آتی —— ؟"

عائشہ نے جواب دیا " تم جو رشید کا نعم البدل ہو —— ؟"

سرمایہ دار

مزدور لیڈر نے سرمایہ دار دوست سے کہا ـــــــــ
میرے پاس ایک کروڑ روپیہ ہو تو اُسے اِس بزنس میں لگاؤں، اُس کارخانے کو خرید لوں، فلاں ہل اسٹیشن پر کوٹھی بنواؤں، فلاں فلاں موٹر بھا رکھوں، دنیا کا سفر.........."

سرمایہ دار دوست نے بات کاٹ کر کہا ـــــــــ
"ٹھیک ہے، تم میرے ہم خیال ہو، تم سرمایہ دار ہو ـــــــــ"

بھونرا

وہ محلوں میں پلی، باغوں میں کھیلی اور پھولوں کی ہم نشینی سے خود ایک نورس کلی دکھائی دینے لگی، اُسے گلاب اور بنفشے کے پھولوں سے محبت تھی، اتنی محبت کہ اس نے گلاب اور بنفشے کی زندگی آرٹ بنادی تھی ــــــ

مگر وہ بھونرے سے نفرت کرتی تھی ــــــ بدصورت سیاہ رُو خونخوار خون چوسنے والے سرمایہ دار کی طرح پھولوں کا رس چوس کر انہیں کملا دینے والا ظالم بھونرا۔ وہ بھونرے سے نفرت کرتی تھی اور ڈرتی بھی تھی ــــــ کتنی بھیانک تھی اس کی آواز بھن! بھن!! بھن!! بھن!!!...

اس نے بھونرے سے پھول کو بچانے میں بڑی بڑی تدبیریں کیں لیکن پھول نہ بچ سکے۔ بھونرا خوفناک بھی تھا اور تیز پر بھی ــــــ

وہ بھونرے کے پیچھے دوڑتی لیکن اُسے افسوس تھا کہ اُس کے پر نہیں ہیں۔ کبھی وہ سوچتی کہ اگر اُس کے پر ہوتے تو وہ بھونرے کا مقابلہ پھر بھی نہ کر سکتی۔ زیادہ سے زیادہ اُس چمکدار خوشرنگ پروں والی تتلی کی طرح وہ اڑتی پھرتی۔ لیکن اس خیال سے ڈر جاتی کہ اگر بھونرا بھی اسی کے برابر قدو قامت کا ہو جاتا تو کیا ہوتا ــــــ؟

وہ بھونرے سے نفرت کرتی رہی اور بھونرا پھولوں کا رس

چوستا رہا۔

تھوڑے زمانے کے بعد انقلاب ہوگیا ——— آج وہ باغ میں تنہا نہ تھی بلکہ اُس کے ساتھ اُس کا شوہر بھی سیاہ سوٹ پہنے ٹہل رہا تھا ——— وہ کبھی اس کے گلے میں باہیں ڈالدیتی کبھی وہ اُس کے لب لعلیں کا رس چوس لیتا کبھی وہ دونوں کھُسر پھُسر باتیں کرنے لگتے ———

کبھی وہ دوڑکر ایک خاص پھول کے پاس جاتی اور اپنے محبوب کو دکھاکر کہتی کہ یہ پھول بھی اُسے اتنا ہی پیارا ہے جتنا وہ ——— ! اور شوہر کھلکھلا دیتا ——— دفعتہً اس نے دیکھا کہ شبنمی آنکھوں میں طوفانی برہمی دکھائی دے رہی ہے سامنے بنفشے کے تختے پر چار چھ بھونرے منڈلا رہے تھے ——— اس کا غصہ بڑھتا جارہا تھا ——— شوہر نے پوچھا۔

"کیا ہوگیا ——— ؟"

"مجھے بھونروں سے نفرت ہے، ظالم ہوتے ہیں پھولوں کے قاتل"

"افوہ! آہاہا! اوہ ہو! ہاہا! ہاہا! ———" شوہر ہنسی کے مارے بے خود ہو رہا تھا۔

"کیا ہوگیا ——— ؟" چڑکر پھول کی شیدائی نے پوچھا"

بھونرا! بھونرا تو پھول کی جان ہے جس طرح مرد عورت کی روح"

"کیا ——— ؟"

شوہر نے گانا شروع کیا ـــــ

"پھول سجنیا مورا من بھوں را............"

اس نے سنا ـــــ پھر ذرا قریب آئی پھر اپنا سر اس کے سینے پر رکھدیا ـــــ وہ منہ ہی منہ میں کہہ رہی تھی۔

"تم بھونرے ہو، میں پھول؟ کیا تم بھی میرا رس چوس کر چلے جاؤ گے اور میں کملا جاؤں گی؟ ـــــ"

قاتِلِ مُحبّت

"تم چند دن میں اُس کی بیوفائی بھول جاؤ گے ——— " راج مل نے جوش سے خلوص اور ہمدردی کے ساتھ کہا ———

"میں اسے زندگی بھر نہیں بھول سکتا ——— ہر لمحہ اسی کی یاد اور اس کی بیوفائی کا خیال دماغ کو پریشان کرتا رہے گا ———"

"تمہارا فلسفۂ زندگی غلط ہے ——— مجھے دیکھو ———"

"کیا تم نے بھی محبت کی ہے ——— اور......."

"ہاں ——— اور مجھے بھی ناکام ہونا پڑا ـ"

"کس نے تمہیں یہ پہاڑ سا غم دیا۔ بڑے سخت جان ہو جو زندہ ہو"

"میں زندہ ہوں اور خوش ہوں ———"

"کیا تمہیں اس کی یاد نہیں ستاتی ———"

"میرا مقولہ ہے ——— کہ

——— وفا کیسی، کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو ———"

"مجھے اوشا سے ایسی امید نہ تھی کہ کمار کے مقابلے میں وہ ......"

"مجھے بھی امید تھی ———"

"اُف! تم نہیں سمجھتے وہ مجھ سے کتنی محبت کرتی تھی ———"

"وہ ہر ایک سے اتنی ہی محبت کر سکتی ہے .... اور"
"اور! اور، اس کی محبت کو ٹھکرا سکتی ہے؟ ———"
"بالکل ———"
"کیا مطلب؟ یعنی اس نے مجھ سے پہلے دوسروں سے بھی محبت کی ہے .... ؟"
"تم نے بھی تو اس سے پہلے شیلا سے پینگ بڑھائے تھے ...."
"وہ محبت نہ تھی بلکہ تفریح ———"
"اوشا کا بھی یہی خیال ہے کہ وہ تم سے محبت نہ کرتی تھی بلکہ تفریح کر رہی تھی ———"
"یہ میری محبت کی توہین ہے۔"
"محبت میں توہین ہی محبت کی قاتل ہوتی ہے ———"
"میں انتقام لوں گا ———"
"کسی اور سے محبت کر لوگے انتقاماً ———"
"بہت دیر سوچنے کے بعد جوشی نے کہا ——" میں شیلا سے پھر محبت کر لوں گا ———"
"مگر شیلا تم سے محبت نہ کرے گی اپنی محبت کی توہین کا وہ انتقام لے رہی ہے ———"
"کس طرح! ———" حیرت سے اس نے پوچھا۔
"وہ آج کل مجھ سے محبت کر رہی ہے اور میں اور وہ عنقریب

شادی کرلیں گے ـــــــــــ"

"پھر میں کیا کروں ـــــــــــ؟ اپنی محبت کی توہین کا انتقام کس سے لوں ـــــــــــ"

"توہینِ محبت، محبت کی قاتل ہوا کرتی ہے ـــــــــــ جاؤ سیاسی لیڈر بن جاؤ، محبت قتل ہو جائے گی ـــــــــــ"

ساتھی

"آخر میں بھی انسان ہوں، مرد ہوں، خدا کی مخلوق ہوں، کانا ہو تا دنیا کا ایسا عیب تو نہیں کہ مجھ سے خاندان کی کوئی لڑکی شادی نکرے" رشید نے خطیبانہ انداز سے اپنا حق جتاتے ہوئے چچا کو ہموار کرنے کی کوشش کی جن کی لڑکی سے وہ شادی کے لئے پیغام دے چکا تھا ——————

"میں شادی تو لڑکی کی مرضی کے بغیر نہیں کر سکتا۔ تم صاحب جائداد ہو، دولت مند ہو مگر ...."

اس سے آگے چچا کچھ نہ کہہ سکے۔ وہ رشید سے انکار کر چکے تھے لیکن زیادہ دلآزاری انھیں مقصود نہیں تھی ——————

"اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مجھ سے شادی نہ کرے گا —— میں یونہی رہوں گا ——————"

چچا نے کچھ جواب نہ دیا مگر وہ سوچنے لگے کہ چچاؤں، ماموؤں پھوپھیوں اور خالاؤں نے انکار کر دیا ہے۔ محلّے والے بھی بدصورت کانے رشید کو اپنی بیٹی نہیں دینا چاہتے —————— اور بغیر جواب دیئے وہ چلے گئے ——————

رشید کلکتے سے واپس آگیا۔ اُس کی مصنوعی آنکھ بھی بن چکی تھی

اور اس کے ساتھ ایک بیوی بھی تھی۔ بیوی خوبصورت تھی اور بے پردہ نرسیں سب بے پردہ ہوتی ہیں۔ وہ فخر کے ساتھ اُسے محلّے میں بے پردہ لئے پھرتا تھا سب جلتے تھے، وہ خوش ہوتا تھا۔

کچھ دن گذر گئے —— اور اس قصّہ کی شہرت مٹ گئی۔ لیکن رشید کے گھر میں اس کی نرس رفیقۂ زندگی نے دوست ڈاکٹروں کا ایک گروہ پیدا کر لیا۔ اور ڈاکٹر حامد سے اُسے خصوصیت پیدا ہو گئی۔

رشید یہ گوارا نہ کر سکتا تھا۔ وہ زود حس اور عزّت دار تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کر لیا —— میں یہ گوارا نہیں کر سکتا ——"

"میں اپنی آزادی قربان نہیں کر سکتی —— دونوں میں جھگڑا بڑھ گیا تھا۔

"تم میری بیوی ہو کر یوں عشق و محبت کا ڈرامہ نہیں کھیل سکتیں۔۔"

"میں تمہاری بیوی ہوں مگر ساتھی نہیں ——"

"ساتھی! ساتھی کا کیا مطلب ہے ——؟"

"عورت کے لئے ساتھی وہ ہے جس سے وہ محبت کرتی ہو۔۔۔"

"تو تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں ——؟"

"نہیں ——"

"پھر شادی کیوں کی ——؟"

"میں دولت اور عیش سے محبت کرتی ہوں ——"

"مگر میں کیا کروں ——؟" بے بسی سے یک چشم بدرُ د شوہر

نے پوچھا۔

"مفاہمت کر لو ——— تم بازار حسن کی سیر کیا کرو، تمہارے پاس دولت ہے میں ڈاکٹر حامد سے محبت کروں گی۔ دنیا کی نظر میں ہم تم ساتھی بنے رہیں گے ———"

شوہر اور بیوی نے مصالحت کر لی ——— اور زندگی بھر دونوں ساتھی بنے رہے۔

آنیوالا زمانہ

ایک مراقی لیڈر جو موسم بہار کے آغاز پر سنک جاتا تھا ایک مراقی اخبار نویس سے الجھ گیا۔ اخبار نویس بولا:۔

امن و جنگ کے مسائل کو سمجھنا مذاق نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اخبار نویس سے زیادہ امن و جنگ کے مسائل کو کوئی نہیں جانتا۔ آنے والے زمانے میں یہ ہوگا اور وہ ہوگا۔ ٹرکی درِ دانیال پر دو ہزار برس قابض رہے گا۔ ایک دور آنے والا ہے جب کہ یورپ میں پھر آلِ عثمان کی حکومت قائم ہوگی ——— جبکہ ہندستان آزاد ہو کر لنکا اور مشرقی مجمع الجزائر میں اپنی نو آبادیاں قائم کرے گا۔ جبکہ انڈمان جنّت ارضی کا ایک نمونہ بن جائے گا جبکہ کشمیر کے موسم بدل کر وسط ہند کے سے موسم ہو جائیں گے۔ جب پنجاب میں لوگ لسی کے بجائے شراب پیا کریں گے اور بمبئی میں چائے کے بجائے "وِمٹو" کے جام چلا کریں گے ———

مراقی لیڈر سنتے سنتے دل چسپی کے ساتھ ناچنے لگا ———

"ٹھیک کہتے ہو، ٹھیک کہتے ہو ———————

میں ٹرکی کا بادشاہ بنوں گا۔ چرچل کی اولاد روس پر حکومت کرے گی۔ اسٹالن کی لڑکی غزل گوئی میں کمال حاصل کر کے جگر کے بیٹے سے شادی کر لے گی ——— سیاسی لیڈر بیان دیں گے تو اخبار

انہیں شائع نہ کریں گے ـــــــ فلم ایکٹروں کا بول بالا ہوگا۔ کتابیں پڑھانے کے بجائے گھول کر پلائی جایا کریں گی عشق گزوں سے ناپا جائیگا اور لباس صرف روحانی احساس بن کر رہ جائیگا ـــــــ حسن ترازو کی تول سے فروخت ہوا کرے گا ـــــــ اور حسین مخلوق میں ہوائی جہازوں کا سب سے پہلا نمبر رہا کرے گا ـــــــ سینماؤں کے اندر اخبار پڑھوائے جایا کریں گے اور اخبار کے صفحات پر فلم دکھائے جائیں گے ـــــــ فوج کے سپہ سالار قومی لیڈر بن جائیں گے اور قومی لیڈر مشاعرے کیا کریں گے ـــــــ"

اخبار نویس نے چڑ کر کہا ـــــ "پاگل ہو ـــــ"

مراقی لیڈر ہنس کر بولا ـــــ "عقل مند ہو ـــــ"

ایک غور و فکر کے عالم میں اپنے رستے ہو لیا۔ دوسرا بڑبڑاتا ایک طرف چل کھڑا ہوا۔

حمّام میں سب ننگے

وہ اپنے باپ کے قدم بہ قدم چل رہا تھا۔ اور باپ خاندانی روایات کے مطابق موسیقی و حسن کا دلدادہ تھا ——— کہا جا سکتا ہے کہ باپ اور بیٹا دونوں خاندانی روایات پر عمل کر رہے تھے۔ بیٹا جوان ہو گیا تھا لیکن باپ کو اس کی جانب سے کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ باپ کہتا تھا کہ ہمارا زمانہ کیف و سرور اور شراب و شباب کا زمانہ تھا آج کل کے لوگ یہ باتیں کیا جانیں انہیں بی' اے' ایم' اے' لیڈری اور سینما سے فرصت کہاں ——— بیٹا باپ کے ذوق کی داد دیتا اور رفتہ رفتہ باپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا۔ آخر کار اُسے بھی یہ سعادت حاصل ہو گئی ——— بازارِ حسن میں وہ بھی ایک جوھری کی حیثیت حاصل کرنے کی بازی کھیل رہا تھا۔

شہر میں ایک حسن صورت و سیرت کی ملکہ' ملکہ جان نازل ہوئی۔ جگہ جگہ جلسے ہوئے۔ کہیں کہیں باپ بیٹے مہانوں کی حیثیت سے ساتھ ساتھ گئے۔ رفتہ رفتہ شہرت نے پرستارانِ حُسن و خوش گلوئی کو کوٹھے پر کھینچ بلایا۔ پینتالیس سالہ باپ اور بیس سالہ بیٹا دونوں کو اس بارگاہ میں قربت حاصل تھی دونوں اس فنکار ساحرہ کے متوالے تھے۔

ہونیوالی بات ٹل نہیں سکتی۔ باپ بیٹے کی مڈبھیڑ ہو گئی۔

——باپ نے خفگی سے پوچھا——"تم !؟"

بیٹے نے حیرت اور پشیمانی سے پوچھا——"آپ !؟"

باپ نے قابو پالیا" ہاں ہیں اور تم دونوں——...... مگر——"

بیٹے نے بات کاٹ کر کہا۔

"مگر! ہیں..........۔"

"تم کیا...... کیا ہوا تمہیں؟......"

"میں ملکہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں——"

"تم! ملکہ سے شادی——!؟"

"جی ہاں!——"

"مگر وہ تم سے شادی نہ کرے گی وہ مجھ سے نکاح......"

ملکہ نے بات کاٹکر کہا——"میں کسی سے نکاح شادی نہیں کروں گی"۔

تماش بینوں نے قہقہہ لگایا——

باپ نے بھی قہقہہ لگایا۔ بیٹا بھی متبسم ہوا۔ سب بیٹھ کر پھر گانا سننے لگے۔——

اصل سوال

سوشلسٹ نے کہا۔ "اصل سوال روٹی کا ہے"۔
فلسفی نے کہا — "اصل سوال احساس کا ہے"۔
سرمایہ دار نے کہا — "اصل سوال دولت کی پیداوار کا ہے"۔
مسلمان نے کہا۔ "اصل سوال پاکستان کا ہے"۔
ہندو نے کہا — "اصل سوال ہندی کا ہے"۔
طوائف بولی — "اصل سوال گاہکوں کا ہے"۔
کنوارے نے کہا — "اصل سوال عورت کا ہے"۔
عورت نے فریاد کی۔ "اصل سوال آزادی کا ہے"۔

خدا نے سب کچھ سنا اور مسکرا کر کہا۔ احمقوں کے لئے کوئی نہ کوئی اصل سوال ہمیشہ باقی رہے گا۔ اصل میں اصل سوال کچھ نہیں۔ اگر ہے تو اصل سوال عقل کا ہے۔ "عقل ہو تو کوئی سوال سوال نہیں رہتا۔

بدگمانی

دو سال سے گربچن سنگھ سمندر پار فوجی خدمات انجام دے رہا تھا ——

اُسے خط ملا کہ اُس کی بیوی کے لبطن سے تیسرا بچہ پیدا ہوا ہے ——

اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ دو سال سے وہ گھر نہیں گیا تھا —— اس نے تار دیا۔ معلوم ہوا کہ خبر غلط ہے لیکن اُسے یقین نہ آیا۔ اُس نے رخصت کی درخواست کی لیکن رخصت منظور نہ ہو سکی۔ اُس نے افسروں کو واقعہ بتایا اور اپنی ذہنی پریشانی ظاہر کر کے مدد چاہی —— افسروں نے تحقیقات کا وعدہ کیا اور دو مہینے کے بعد یقین دلایا کہ خبر غلط ہے لیکن اُسے پھر بھی یقین نہ ہوا اُس نے سوچا کہ رخصت نہ دینے کا یہ بہانہ ہے۔

موقع پا کر ایک دن وہ بھاگ نکلا۔ لیکن بھاگ کر پنجاب کیسے پہنچتا گرفتار ہونا پڑا۔ کورٹ مارشل نے اُسے پانچ سال کی سزا دیدی ——

اُسکا گارڈ کہا کرتا ہے کہ تجھے عقل نہیں۔ نمبر کی غلطی سے تجھے دوسرے گربچن کا خط مل گیا تھا۔ لیکن تیری بدگمانی یقین دلانے کے باوجود بھی دور نہ ہوئی ——!

وہ گارڈ کی بات کا بھی یقین نہیں کرتا۔ اُسے یقین ہو گیا ہے کہ بیوی بدچلن ہے اور افسر اس کی بدچلنی کے رازدار ہیں۔

ایجاد

مفلس فرانسیسی باغبان مونئیے کی فطرت اور بدمزاجی کو ہر انسان سمجھنے سے قاصر تھا جب تک وہ ایک بیکار انسان کی حیثیت سے زندگی گذارتا رہا، افلاس کے ہاتھوں اسکا سارا نظام عصبی تباہ ہو گیا۔ بات بات پر وہ بگڑ اٹھتا اور گھر کے برتن، چینی کی قابیں، گلدان اور شیشے کے برتن توڑ پھوڑ ڈالتا۔

پھر خود اُسے افسوس ہوتا اور اس حرکت پر ندامت کے باعث وہ کبھی کبھی اپنی ذات پر لعن طعن اور نفرین کرتا —— ایک دن اسے خیال پیدا ہوا کہ یہ برتن کچھ مضبوط یا سستے بنوائے جائیں تو اچھا ہے تاکہ قیمتی برتنوں کے نقصان سے بچا جا سکے چنانچہ اُس نے لوہے کے تاروں سے ایک گلدان کی شکل بنائی پھر چٹائی سی کر اس پر سیمنٹ کا پلاسٹر کر دیا۔ سیمنٹ کے پلاسٹر سے گلدان بہت خوبصورت بن گیا جس پر اس نے سفید پالش بھی کر لیا ——

مونئیے کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب غصے میں اس نے سیمنٹ اور تار سے بنے ہوئے گلدان کو دو منزلہ کمرے سے نیچے پھینکا لیکن اس کا ایک ریزہ بھی منتشر نہ ہو سکا۔ اس نے بار بار اس کا تجربہ کیا لیکن یہ ایجاد پتھر سے بھی زیادہ سخت تھی۔

انجینیرنگ کے ایک سائنسداں نے جو اپنے کمرے کی کھڑکی سے

موتنٹے کی اس وحشیانہ حرکت کا مشاہدہ کرتا رہتا تھا۔ آج گلدان کو ٹوٹتا نہ دیکھکر سخت تعجب کیا۔ اور تحقیق کرنے پر موتنٹے سے حق ایجاد خرید لیا۔

موتنٹے کو شدید افلاس سے ضرور نجات مل گئی۔ لیکن اس کے پڑوسی انجینرنگ سائنس کے ماہر ہنتے بینکے نے کروڑوں روپیہ آہن اور کنکریٹ سیمنٹ سسٹم ایجاد کرکے پیدا کر لیا ——— آج جنگ کی یہہ قلعبندیاں موتنٹے کے غصے اور بد مزاجی کی یادگار باقی ہیں ———

خودکشی

رشید صبح اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا۔ زہر کی ایک شیشی بستر کے بازو میں پڑی تھی ــــــــــــ

کل ہی اُس کا دیوالہ نکل گیا تھا اور السی اور تل کا مارکیٹ اس کی امید کے بالکل خلاف اتنا گر گیا تھا جس سے اُسے خود اپنی زندگی کی ساری اور اپنے باپ کی کمائی ہوئی دولت تک سے ہاتھ دھو لینا پڑا تھا ــــــــ

تجارتی کاروبار کے سٹے کیا کچھ نہیں کر سکتے ــــــ کچھ کاروباریوں کو اُس سے ہمدردی تھی اور وہ اسے ٹٹا نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اس نے اپنے دوستوں سے کہا تھا کہ اب بے زر و بے پر زندہ رہنا بیکار ہے ــــــ

سیٹھ بھنورلل رشید کی تجہیز و تکفین کے بعد مرحوم کی بیوہ سے جو ابھی چند دن پہلے بیاہ کر آئی تھی ہمدردی کرنے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ رشید کی خودکشی شدید احساسِ غم کا نتیجہ تھی ــــــ بیوہ ــــــ نئی دلہن کیا جواب دیتی۔ بظاہر تو وہ غم سے نڈھال ہو رہی تھی ــــــــ

تیسرے دن جب مہمان رخصت ہو گئے اور گھر میں صرف رشید کی بیوہ اور بوڑھی ماں باقی رہ گئیں ــــــــ تو گھر پر ایک ہو کا عالم طاری ہو گیا۔ رشید کی ماں ایک زندہ لاش دکھائی دیتی تھی جس پر جوانمرگ اکلوتے بیٹے کی یاد میں غم کے دورے پڑ رہے تھے اور ایک گوشہ میں پڑی سسک

رہی تھی ——————

نورجہاں پر بھی فضا کی اُداسی نے اداسی طاری کر رکھی تھی۔ لیکن بیوگی کے سفید دودھ لباس نے اُس کے حسنِ پرکار کو سادگی کے زیور سے آراستہ کر کے اور ابھار دیا تھا۔ ہلکے قدموں کے ساتھ گھر میں وہ آج چلتی پھرتی اس دنیا کی نہیں بلکہ عالمِ بالا کی ایک مخلوق دکھائی دے رہی تھی ——————

شام کی تاریکی کے ساتھ رشید کی ماں کا دل تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا اور نورجہاں گھڑی کی جانب بار بار نظر ڈال رہی تھی ——————

ٹھیک نو بجے رشید کے ڈرائنگ روم کا اندرونی دروازہ کھلا۔ نورجہاں کالا لباس پہنے اُس میں داخل ہوئی۔ اندھیرے میں وہ اس طرح گھل گئی تھی کہ اس کا وجود محسوس کرنا بھی دشوار تھا —————— چند منٹ بعد باہر کا دروازہ انتہائی آہستگی سے کھلا، اور سیاہ پوش نورجہاں ایک سیاہ پوش نوجوان کی آغوش میں چلی گئی —————— تین بجے رات تک دونوں وہیں رہے۔ یہ رشید کا سب سے زیادہ عزیز دوست منصور تھا —————— واپس ہوتے ہوئے منصور نے نورجہاں کے کان میں کہا۔

"خبردار! کبھی اپنی کسی حرکت سے شبہ کا اظہار نہ ہونے دینا۔ تم عورت ہو ایسا نہ ہو کبھی خوشی کے عالم میں راز فاش کر دو —————— رشید کا دیوالہ ہمارے جرمِ قتل کا پردہ دار بن گیا ہے۔ قدرت نے ہماری مدد کی ہے۔ تم انسانیت کی غلطی پر قدرت پانا سیکھو ——————"

شاعر کی محبت

"آہ! طاؤس! تم نہیں جانتیں! میں نے تمہیں اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہے، تم میری تسکین روح و دماغ ہو۔ تمہاری ایک نظر پر کائنات کو قربان کر سکتا ہوں ——————

"آہ طاؤس! تم کتنی سادہ و پُرکار ہو! بخدا! تمہارا یہ تبسم دو جہان میں اپنی قیمت نہیں رکھتا ——————

اُف! تم نے میرے کاشانۂ دل کو التفات کی مشعلوں سے جگمگا دیا ہے ——————

"میں سوچتا ہوں کہ تم مجھ سے اگر بے التفاتی کرو گی تو میں دنیا میں کس کام کا رہ جاؤں گا ——————

طاؤس! میں تمہاری پرستش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ دیکھو! سامنے تمہارا قدِ آدم فوٹو رکھا ہے جب تم موجود نہیں ہوتیں تو میں اس کے سامنے گھنٹوں بیٹھ کر یہی باتیں کیا کرتا ہوں۔ طاؤس! میں دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان ہوں خدا کے لئے مجھے اپنے قدموں میں مر جانے دو ——"

یہ کہکر شاعر بڑھا اور فتنہ کار ساحرہ فلم اسٹار طاؤس کے قدموں میں لوٹنے لگا —————— فلم ایکٹرس خاموش بیٹھی سب کچھ دیکھتی رہی۔ مگر اُس کے لبوں پر ہلکا ہلکا تبسم رقص کر رہا تھا ——————

جب شاعر اپنی آنکھوں کے بیش قیمت موتی اُس کے قدموں پر بجائے اپنی جان کے نچھاور کر چکا تو اُس کو ایک سکون محسوس ہوا اب وہ خاموش دونوں ہاتھوں میں اپنا سر لئے محبوب کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا ——

طاؤس کھڑی ہو گئی "اب میں اجازت چاہتی ہوں"

"خدا کے لئے مجھے تنہا نہ چھوڑو ——" محبت کرنے والے شاعر نے فریاد کی۔

"آپ تنہا نہیں ہیں میری تصویر آپ کے پاس ہے پرستش کیجئے" پرستش کرتے رہے ——"

شاعر لاجواب ہو گیا —— اور طاؤس دروازے پر پہنچ کر رُک گئی۔ اس سے سوال کیا گیا تھا کہ پھر کب اس کے تاریک غمخانہ کو منوّر کریگی۔

"میری موجودگی آپ کی محبت میں کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتی —— آپ پرستش کرتے ہیں میں محبت چاہتی ہوں —— آپ مجھے دیوی بنانا چاہتے ہیں۔ میں عورت ہوں۔ آپ پجاری بننا چاہتے ہیں میں آپ کو ایک سرمست اور خوش باش مرد دیکھنا چاہتی ہوں —— آپ قدموں پر آنسو بہانا معراجِ محبّت سمجھتے ہیں میں ہم کناری کے بادۂ سرجوش سے مست ہونا محبت کا مقصد سمجھتی ہوں۔ آپ کی دیوی وہ تصویر بن سکتی ہے میں شاعری پر انسانیت اور نسائیت کو قربان نہیں کر سکتی ——"

طاؤس چلی گئی۔ شاعر حیران دیکھتا رہ گیا۔

ترقی کا تاج

جنگ میں گیس کا استعمال نہایت بے باکی سے ہو رہا تھا انسانیت پامال ہو رہی تھی اور جنگجو دیوتا ترقی اور تمدّن کے تمام ہولناک اور ہلاکت خیز حربے استعمال کر کے انسانوں کی موت کو اپنے کارناموں سے تعبیر کر رہے تھے

شمالی افریقہ کے ایک بڑے بحری مرکز پر دشمن بے پناہی کیساتھ گیس کے بم برسا رہا تھا۔ ہر طرف ایک تباہی مچی ہوئی تھی سڑکیں اور بازار ویران پڑے تھے۔ زہریلی فضا میں چرند و پرند ہلاک ہو رہے تھے۔ انسان دیوانہ وار بھاگ کر پناہ لینا چاہتے تھے لیکن نہ اتنی تعداد میں پناہ گاہیں موجود تھیں۔ نہ گیس سے بچاؤ کے نقاب۔

فضل غنی لفٹنٹ گیس کا نقاب پہنے ایک عجیب ہیئت کذائی کے ساتھ شہری آبادی کو حتی الوسع بچانے کی مہم میں مصروف تھا زہر کے اثرات سے ڈگمگاتی ہوئی ایک عرب دوشیزہ اس کے بازوؤں میں آ گئی ——

اُف! اُف! یہ ایک نور کا پیکر تھا، ایک مجسمہ رعنائی و زیبائی۔ حُسن و خوبی کی تصویر ——

اس کا سفید لباس حُسن کی سادگی پر ہزار آرائشیں قربان کر سکتا تھا ——

"مجھے بچاؤ، گلا گھٹا جاتا ہے ——"

نیم مدہوشی کے عالم میں وہ بڑبڑا رہی تھی فضل جو اس کے حُسنِ شباب سے مسحور ہو رہا تھا سنبھل گیا۔ اور سہارا دیئے قریب کی پناہ گاہ میں لے گیا۔

"اُف میرا سر چکرا رہا ہے ——" عالم نزع میں دوشیزہ بولی۔

"گھبراؤ نہیں" فضل نے اس کا سر سنبھالتے ہوئے کہا۔ اور پناہ گاہ کی نرس نے کوئی دافع زہر تریاق انجکشن اُس کے بازو میں لگا دیا ——

دوشیزہ سنبھل گئی لیکن یہ سنبھالا موت کا سنبھالا تھا۔ مہیب ترین ہلاکت پھیلانے والے زہر کا حقیقی تریاق انسان کی تباہ کن فطرت ابھی ایجاد نہ کر سکی تھی۔

دوشیزہ سنبھلی اور فضل کو سامنے دیکھکر بولی۔

"مجھے یہ وزنی ٹوپی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ انسان اسے پہن کر بھیڑیا نظر آنے لگتا ہے۔ کیا یہاں ایک بھی انسان ایسا نہیں جس کی اصل صورت دیکھ سکوں؟ ——"

فضل نے نقاب اتار دیا ——"

"خاتون! واقعی ہم بھیڑیئے ہیں —— جب کائنات میں پہلا انسان وجود میں آیا۔ تو اُس کی ہئیت کذائی اوس کی جسمانی ساخت

شکل وصورت ہم سے بہت ملتی جلتی تھی ——— لیکن اُس کی عادتیں سادہ، اُس کی ضرورتیں کم اور اس کی یہ جہنمی روح وجود میں نہ آئی تھی ——— وہ غیر ترقی یافتہ دور تھا ———

"آج ہم ترقی کے سب مدارج طے کر چکے ہیں" ———

اور گیس کا نقاب سر پر رکھتے ہوئے فضل عینی یہ الفاظ دہراتا ہوا ادائیگی فرض کے لئے پناہ گاہ سے باہر نکل گیا۔ کہ ——— "یہ نقاب ترقی کا تاج ہے ———"

چند گھنٹے کے بعد جب وہ پھر پناہ گاہ میں داخل ہوا تو عرب دوشیزہ مر چکی تھی ———

فضل کی زبان سے بے ساختہ ایک آہ نکلی اور پھر وہی الفاظ ——— "ترقی کا تاج ———"

دہراتے ہوئے وہ بھی چکرا کر گر پڑا۔ زہر کا کسی نہ کسی طرح اس پر بھی اثر ہو چکا تھا۔

تلاشِ حُسن

حمید نے کہا ——— "میں بھوکا ہوں ———"

رام چندر اُس کا ساتھی قیدی بولا ——— "بیٹا یہ جیل ہے وقت پر ملے گی ———"

"گدھا ہے تو ——— میں بھوکا ہوں۔ روٹی کے لئے نہیں بلکہ"

"گدھا ہے تو گھاس کھا ———" رام چندر نے بھی مذاق کیا۔

"مذاق نہیں رام چندر تو اس مرتبہ بے گناہ پھنس گیا"۔

دونوں عادی مجرم تھے اس بار واقعی رام چندر بے گناہ پھنس گیا تھا کیونکہ بغیر یہ جانے بوجھے کہ حمید کہاں جا رہا ہے وہ اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔

حمید نے ایک سیٹھ جی کے مکان میں نقب لگایا رام چندر سمجھا کہ بڑا بھاری ہاتھ مارےگا اس بار ——— مگر حمید نے روپیہ پیسہ، مال زیور کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا نہ رام چندر کو کوئی چیز چھونے دی۔ بلکہ وہ سیدھا سیٹھ کی خوابگاہ میں گھس گیا۔ جہاں اس کی حسین بیٹی منورما کے بستر کے بازو میں بیٹھ کر دیر تک وہ سوئی ہوئی دوشیزہ کو دیکھتا رہا پھر اپنے دونوں ہاتھوں میں منورما کا چہرہ اس نے ایک جذبۂ احترام کے ساتھ تھام لیا اور اس کی پیشانی پر ایک بوسہ دیا۔ ——— رام چندر حیران تھا کہ حمید یہ کیا کر رہا ہے لیکن وہ حمید کی اس وارفتگی کو دیکھ کر نہ برہم ہوا نہ معترض بلکہ اُس

کے دماغ میں ایک ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگیا ——————

منورما چیخ مار کر اُٹھ بیٹھی۔ دونوں بھاگنے کے لئے تیار ہوئے مگر سنبھلنے سے پہلے ہی گرفتار کر لئے گئے۔ پولس پہلے ہی سے تعاقب کر رہی تھی۔

رام چند نے کہا —— "ابے بے گناہی اور گُناہ کیسا لیکن تو نے ابکے خالی خولی عشق میں پھنسوا دیا ——————"

"رام چند! عشق، وشق کچھ نہیں، میں بھوکا ہوں ایک اچھی صورت کو چٹ کر لینا چاہتا ہوں —————— سیٹھ کی لڑکی کی صورت مجھے بھاگئی ہے ——————"

"اُلّو کے پٹھے! یہی چیز عشق ہے —————— حسن کی تلاش اور حُسن پر قبضہ کی خواہش کا نام ہی محبت ہے۔ اس لئے ہم تجھے مجنوں کا باپ کہا کریں گے ——————"

جمہوریت

پنچایت میں ایک پنچ نے کھڑے ہو کر کہا۔

"بھائیو! نندا کا حقہ پانی بند کرو کیونکہ اس نے باپ کی موت پر مُکتہ نہیں کیا۔۔۔۔۔۔۔ برادری کی ناک کٹ گئی"۔

سب پنچوں نے کہا "بالکل ٹھیک ــــــ"

دوسرا پنچ کھڑا ہوا اور یوں تقریر کی۔

"بھائیو! نندا بہت غریب ہے، اس کے پاس ایک وقت کھانے کو بھی پیسے نہیں وہ باپ کی موت پر برادری کے سو آدمیوں کو کیسے کھلاتا؟ اس لئے اس سے مُکتہ نہیں لینا چاہیئے بلکہ اس کی مدد کرنا چاہیئے"

سب پنچوں کے لہجے میں ہمدردی نمایاں ہو گئی "بالکل ٹھیک"۔

ایک تیسرا پنچ کھڑا ہوا اور اعتراض کر کے بولا۔

"بھائیو! ہماری پنچایت برادری کی ایک ریت روکنے پر سزا دینے کے لئے بیٹھی ہے نہ کہ دان کرنے کے لئے"۔

سب پنچوں میں سمجھ آ گئی "بالکل ٹھیک دان دینے کے لئے نہیں بیٹھی ــــــ"

چوتھا پنچ سمجھوتہ کرانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بھائیو! نندا نے مُکتے کی ریت توڑی ہے۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ وہ

غریب ہے۔ اس لئے نکتہ کی ریت بھی نہ ٹوٹنے دی جائے اور ننداا
بھیک بھی نہ مانگے ——"

سب پنچوں کی رائے میں پھر تزلزل پیدا ہوا۔ "ٹھیک ہے ——"
پانچواں پنچ بیٹھے بیٹھے بولا۔
ہم سب ننداا کی مدد کریں۔ ننداا اس روپیہ سے نکتہ دے ——"
سب متفق ہو گئے، پنچایت برخاست ہو گئی۔

ناپشیمان

"میرے نزدیک مرد و عورت میں کوئی امتیاز نہیں ــــــ" بیٹا بولا۔

"اوہ ناپشیمان! کم بخت، سوچ تو ذرا کہ عورت پر ہاتھ اٹھاتا ہے ــــــ"

ماں نے غیرت دلائی۔

"میں روپیہ کماتا ہوں۔ مزدور پر مجھے پورا پورا اختیار حاصل ہے ــــــ

یہ کام کا معاملہ ہے پشیمانی کا نہیں"۔

"مگر عورت کا درجہ تیری مہذب سوسائٹی نے بھی اونچا کر دیا ہے ــــ"

"مگر میری مہذب سوسائٹی نے عورت کو مزدوری سے ابتک نہیں روکا"۔

"پیسے کی لالچ میں تو بے جگر بلکہ بے عقل ہو گیا ہے"۔

"پیسہ کمانے کیلئے عقل ضروری ہے اور نفع کیلئے عقل کا تقاضا ہے کہ ظلم

کیا جائے ــــــ مظلوم خواہ عورت ہو یا مرد ــــــ"

"تجھے خدا کو جواب دینا ہے ــــــ"

"مجھے خدا نے اس کی اجازت دی ہے ــــــ"

"تو کافر ہے ــــ خدا پر الزام دھرتا ہے ــــــ"

"تم ناقص العقل ہو۔ میں سرمایہ دار بن رہا ہوں" اگر روزانہ اس عورت کی طرح مزدور کو کاہلی میں وقت گزارنے دوں تو پانچ فیصدی نقصان ہو جائے۔۔!

سرمایہ داری مزدور کی جنس و نوع کو نہیں دیکھتی وہ اسکی محنت سے اندازے لگاتی ہے"

فریبِ مسلسل

اخباروں میں بڑی جلی سرخیوں سے خبر شائع ہوئی کہ اسمبلی کے فلاں ممبر نے ——— فلاں فلم ایکٹرس کو قتل کر دیا ———

عدالت میں لوگوں کا ٹھٹھ لگا ہوا تھا۔ عوام کا لیڈر اور رقّاصہ کا قاتل۔ اسمبلی کے ممبر نے کوئی بیان نہیں دیا اس نے قتل کا اقرار کیا اور ایک مختصر تحریری بیان پیش کر دیا جس میں درج تھا ———"

ہر آدمی عشق کرتا ہے۔ ایک بار یا بار بار میں نے بھی عشق کیا، صرف ایکبار! میں عشق کرتا تھا، میں عشق کرتا رہونگا اور اگر مجھے پھانسی دیدیگئی تو بھی میری روحِ عشق کو زوال نہ ہوگا ———

میں یہ جانتا ہوں کہ عشق ایک خللِ دماغ ہے، مجھے معلوم ہے کہ محبت ایک سودائی بنانے کی مشین ہے ایک فریبِ مسلسل ہے لیکن پھر بھی ہم محبت کرتے ہیں۔ اور جان بوجھ کر اس فریب میں مبتلا رہتے ہیں ——— مبتلا رہنا چاہتے ہیں۔

وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ ہر ظاہر بیں نظر اُسے دیکھکر یہ سمجھتی کہ وہ مجھ سے عشق کرتی ہے ——— کبھی کبھی اُس نے قربانیاں بھی کیں لیکن وہ عشق کو تفریحی مشغلہ سمجھتی

تھی میں نے اپنی جان کی بازی، اپنے اصول اپنی دولت سب اُس کے قدموں میں ڈال دیئے تھے۔ میں اس پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے یقین دلاتی رہی کہ آیندہ یہی ہوگا ـــــــــ لیکن یہ "آیندہ" کی ساعت کبھی نہ آئی۔ اور ایک دن باتوں باتوں میں اُس نے کہدیا کہ وہ شادی کو لعنت سمجھتی ہے۔ عشق کی کامیابی کے لئے مقصودِ محبت کو حاصل کرنے سے ہمیشہ کے لئے ناکامی کو میں لعنت سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اُسے قتل کر کے میں نے پالیا ہے اب وہ کسی دوسرے کے قبضے میں نہیں جا سکتی۔ اس مسلسل فریب کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ جس میں ہم مبتلا تھے اس لئے اے حاکمِ انصاف مجھے بھی اس کے پاس بھیج دینے میں کوتاہی نہ کرو ـــــــــ"

حاکمِ انصاف نے کارروائی مقدمہ کے خاتمہ پر ملزم کو بری کر دیا اس کے خیال میں قتل فوری اشتعال کا نتیجہ تھا ـــــــــ

پگلی

بال سر کے منڈے ہوئے، وہ سڑکوں پر دن رات آوارہ گھوما کرتی کبھی کبھی اس پر دیوانگی کے شدید دورے پڑتے، اور وہ راہگیروں کی پتھروں سے اس بری طرح خبر لیتی کہ راستہ بند ہو جاتا ——————

اس کی عمر صرف گیارہ سال تھی لیکن وہ بھوک اور بیماری کے باعث کسی طرح نو سال کی بچی سے زیادہ نہ دکھائی دیتی۔ احمد نگر میں اُسے آئے ابھی دو تین مہینے ہوئے تھے، بچے اُسے چڑاتے، کبھی کبھی پتھر مار کر زخمی کر دیتے۔ چوٹ کھا کر وہ سیدھی تیلی کھوٹ پر شکور باورچی کی دوکان پر آتی یہ پہلوان باورچی اُس کی خدمت کرتا، اُسے کھانے کو دیتا، اُسے کپڑے بدلوا دیتا اور وہ اکثر رات کو اُسی کی دوکان کے پٹھوں پر پڑ رہتی۔ وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتی مگر شکور پہلوان باورچی کا کہنا مان لیتی۔ احمد نگر کے تمام لوگ شکور کی اس خدا ترسی کے مدّاح تھے ———— اس طرح ایک سال گذر گیا۔ بسم اللہ پگلی احمد نگر میں گھومتی رہی اور سارا احمد نگر اس سے واقف ہو گیا۔ بعض ہندو محلوں میں عورتیں اُسے دیوی کا اوتار سمجھنے لگیں۔ بعض خوش عقیدہ اسے خدار سیدہ اور مجذوب کا درجہ دیکر اس کی عظمت کرنے لگے اور اُس سے ڈرنے لگے، بعض گھروں

میں بچّوں کو "بسم اللہ" کے نام سے ڈرایا جانے لگا۔ اس کی صورت بھی ڈراؤنی تھی۔ اور اُس کی باتیں بچوں کو زیادہ ڈرا دیتی تھیں

اور اب کچھ دن کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ وہ شکور باورچی پہلوان کو جب دیکھتی تو اُس پر دیوانگی کا شدید دورہ پڑ جاتا، وہ اُسے پتھر مارتی۔ سخت مضطرب ہو جاتی اور خدا جانے کیا کیا بکتی اور جب تک شکور اُس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جاتا وہ سکون پذیر نہ ہوتی۔ اس تبدیلی کا سبب کسی کی سمجھ میں نہ آیا ——— رفتہ رفتہ لوگوں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ "بسم اللہ" نے جوانی میں قدم رکھدیا ہے۔ اس کا جسم سڈول اور وزنی ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اُس کے گال بھرنے لگے ہیں اس کی آنکھوں میں وہ حلقے باقی نہیں رہے جو ڈیڑھ سال پہلے نظر آتے تھے ——— کچھ من چلے کبھی کبھی گناہگار نگاہ بھی ڈال کر یہ جائزہ لیتے کہ کیا "بسم اللہ" ایک عورت کہی جا سکتی ہے ——— چھ مہینے اور اسی عالم میں گذرے۔ ان چھ مہینوں میں بسم اللہ کا جسم و جثّہ اور دیوانگی ساتھ ساتھ بڑھتی رہیں۔ ان چھ مہینوں میں باورچی کے ہمسایہ دوکانداروں کا تجربہ یہ بھی تھا کہ بسم اللہ باورچی کی بند دوکان کے سامنے پہنچتے ہی دیوانگی کے دورے سے بے قابو ہو کر اینٹ، پتھر کی بارش کر دیتی۔ کوئی اس تبدیلی کو نہ سمجھا لیکن وہ ڈیریاں جنھوں نے پگلی کو دیوی کا اوتار مان لیا تھا تاڑ گئی تھیں کہ بسم اللہ ماں بننے والی ہے۔

چند مہینے بسم اللہ غائب رہی۔ اور شکور بھی احمد نگر میں نہ دکھائی دیا ــــــ لیکن ایک دن وہ پھر نظر آئی۔ اور اس کے بازوؤں میں ایک خوبصورت ننھا سا بچہ بھی تھا۔

شکور کی دکان کے سامنے پہنچ کر وہ بند دوکان کے پھٹوں پر بیٹھ گئی۔ اُس میں دیوانگی کے آثار بالکل دکھائی نہ دیتے تھے۔ وہ کمزور نظر آتی تھی۔ لیکن اُس کی نگاہوں سے ایک قسم کی آسودگی، ایک مطمئن کن جذبہ ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اور چند بچے اس کے آس پاس کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ برابر کی دوکان سے ایک بوڑھے سے تنبولی نے پوچھا۔

"بسم اللہ یہ کس کا بچہ ہے ــــــ؟"

"شکور کا ــــــ" بسم اللہ نے جواب دیا، اس کے لہجے میں مکمل فرزانگی موجود تھی۔

"شکور کا!" حیرت سے تمباکو فروش نے پوچھا۔

"وہ باپ ہے اس کا ــــــ" بسم اللہ نے پورے اطمینانی لہجے میں جواب دیا۔

"کہاں گیا شکور ــــــ؟"

"مر گیا ڈوب کر ــــــ"

"مر گیا ــــــ!!" سب کی زبان سے نکلا

"ہاں! وہ کہتا تھا کہ میں اُسے بچے کا باپ نہ کہوں"!

"پھر ——— ؟" بے صبری سے سب نے پوچھا۔

"میں نہ مانی ——— اور پرسوں اس نے کنوئیں میں ڈوب کر جان دیدی ———"

سُننے والے حیرت میں آکر خاموش سوچنے لگے۔ بسم اللہ نے تنبولی سے چار آنے مانگے۔ پاؤ بھر دودھ لے کر پیا۔ اتنے میں ایک سپاہی آیا اور بسم اللہ کو پولس اسٹیشن لے گیا ———

سب سے بڑا فتنہ

گھنشیام داس گپتا مشہور ساہوکار رام داس گپتا کے فرزند ارجمند اور کئی ملوں کے مالک تھے ——— نول رائے چودھری بیرسٹر، دہلی کے مشہور قانون داں اور منصف تھے۔ سیٹھ جی کے قانونی مشیر ہونے کے ساتھ ہی ساتھ وہ ان کے دوست بھی تھے اور دونوں میں بے انتہا یارانہ تھا ———

ایک دن کھانے پر بات چھڑ گئی۔ روزانہ ہی کچھ نہ کچھ گپ شپ رہتی تھی۔ آج کا موضوع تھا علم یا دولت ———

سیٹھ گھنشیام داس جی کو دولت پر بھروسہ تھا۔ بیرسٹر چودھری اسے فتنہ کہتے تھے .... اور علم کی طاقت پر یقین رکھتے تھے۔ بحث لمبی چلی دونوں میں کوئی جیتا نہ ہارا۔ اور یہ فیصلہ ہوا کہ وقت پر حالات اس کا خود فیصلہ کر دیں گے ——— کہ فتنہ علم ہے یا دولت۔؟

صوبوں کے الیکشن ہونے لگے۔ گھنشیام داس جی امیدوار تھے مگر مل مالکوں کے نمائندے۔ مزدوروں نے چودھری کو اپنا نمائندہ بنانا چاہا۔ دوستی آڑے آئی۔ چودھری جی نے بہت منت سماجت کی کہ سیٹھ جی الیکشن اُن کے خلاف نہ لڑیں۔ سیٹھ جی نے نہ مانا۔ وہ پچاس ہزار روپیہ چودھری کو دست برداری لینے پر دینے کو تیار تھے، اور ایک

لاکھ روپیہ الیکشن پر خرچ کرنے کو ——

مگر ٹکر ہوئے بغیر نہ رہی —— مقابلہ سخت ہوا۔ تعلقات بھی ٹوٹے اور الیکشن جن بنیادی اصولوں پر لڑا گیا انمیں بُعد المشرقین تھا سیٹھ جی ہار گئے۔ یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا ——

جب وزارت بنی تو چودھری صاحب لیبر منسٹر بنا دیئے گئے۔ سیٹھ جی کو بڑا خطرہ پیدا ہو گیا۔ کیونکہ چودھری نے مزدوروں کی حمایت میں ہر اُس اقدام کی مخالفت کرکے اُسے ناکام بنا دیا تھا جس میں مزدوروں کا نقصان اور مالکوں کا فائدہ ہو —— آخر ایک موقعہ آ گیا۔ گھنشیام داس مل میں اسٹرائک ہوا۔ معاملہ بڑھتے بڑھتے لیبر کمشنر اور لیبر منسٹر تک پہنچا فیصلہ مزدوروں کے حق میں ہوا۔ سیٹھ جی کی دولت کے وقار کو بڑا دھکا لگا۔ سیٹھ جی نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا اور لیبر منسٹر اور کمشنر پر مقدمہ دائر کر دیا دو سال مقدمہ چلنے کے بعد بھی مزدوروں کی جیت ہوئی۔ سیٹھ جی ہارے اور ہار کے ساتھ اُن کے ذہن میں یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ اگر وہ چودھری کی جگہ ہوتے تو کس درجہ فتح مندی کے جذبے کو محسوس کرتے اور نہ صرف مزدوروں میں بلکہ عوام میں بھی ہر دلعزیزی حاصل کر لیتے ——

بہت دن وہ سوچتے رہے کہ اصل فتنہ کیا ہے۔

اس کے بعد ڈھائی لاکھ کا نقصان، اور دولت کا وقار ضائع ہو جانے کے بعد انہوں نے ایک خط میں چودھری صاحب سے نہ صرف اپنی بد دماغی اور غلط فہمی کا اعتراف کیا بلکہ انہیں یقین دلایا کہ عقل اور

علم ہی عوام کے لئے ایک خزانہ ہیں۔ اور دنیا کا فائدہ اسی میں ہے کہ عقل و علم اور دولت علیحدہ علیحدہ رہیں۔ اگر تینوں یکجا ہو جائیں۔ تو اُس سے بڑا فتنہ دنیا کے لئے کوئی نہیں ہو سکتا ——— یہ نئی دریافت تھی۔

طوائف

"ذرہ نوازی ہے۔ میں کس قابل ہوں۔ ابھی غریب الوطن ہوں"۔
دہلی میں نو وارد طوائف نے "خان بہادر حلیم" کے ستائش گرانہ قصیدے کا جواب دیا۔ آج پہلی بار ایک شریف گھرانے میں جمنا بائی کا مجرا ہوا تھا خان بہادر کا خیال تھا کہ جمنا بائی اخلاق، صورت سیرت میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں ——— اور جمنا بائی نے اس خراجِ عقیدت کو قبول کر لیا تھا اب ہر آٹھویں دن ان کا مجرا ہوتا اور مقربینِ بارگاہ کو اس مبارک مجلس یا دربار میں بار ملتا ———

گیارھویں ہفتے جمنا بائی خان بہادر کی خلوت نیاز میں موجود تھیں اور ان کے کوٹھے پر تمام استاد، اُن کی نائکہ اور برادری کی طوائفیں دعوت اور کھانے کھلانے میں مصروف تھیں۔

دس بجے صرف گھنٹہ بھر ٹھیرنے کے بعد جمنا بائی نے جانے کی اجازت مانگی بلکہ ضد کی کہ خان بہادر بھی دعوت میں شریک ہوں ——— وہ نہیں جا سکتے تھے۔ شرافت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ طوائف کے کوٹھے پر نہ جاؤ۔ وہ اپنے گھر بلائی جا سکتی ہے ——— اس لئے جمنا بائی تنہا آئیں ———

جب سب مہمان چلے گئے تو نائکہ نے جمنا بائی سے کہا:۔

"بیٹی! اس موذی کو جب تک بالکل غارت نہ کر دینا پیچھا نہ چھوڑنا۔ یہی وہ زمیندار ہے جس کے باپ نے تیری ماں کو اس پیشے پر مجبور کیا۔ اُس کی جوانی، عصمت اور دوشیزگی بلکہ اس کی دنیا لوٹ لی ——— اور خود شریف بن کر اُس سے روپوش ہو گیا ——— بیوفا مرد کی زندگی ہمیشہ ایسے ہی کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ تیری ماں شریف زادی تھی۔ وہ ہمیشہ اس پیشے سے نفرت کرتی رہی اُس نے جتنے پیسے کمائے اُس سے زیادہ قیمتی آنسو ضائع کر دیئے۔ تو بھی نفرت کرتی ہے۔ مگر دنیا تجھے ابھی ایک شریف انسان کی حیثیت سے قبول کرنے کو تیار نہیں۔ فکر نہ کر۔ شریف بن کر بھوکا مرنا بھی شرافت نہیں ہے۔ خدا نے انتقام لینے کے لئے تجھے اس مرد پر مسلط کیا ہے آنے والے زمانے میں امید کی ایک کرن دکھائی دے رہی ہے ——— جب ہم اور تم زمانے یعنی سماج کی ٹھکرائی ہوئی مخلوق بھی شریفوں میں گنی جا سکے گی ——— میں شاید اُس وقت تک زندہ نہ رہوں لیکن تو ضرور یہ دن اپنی آنکھوں سے دیکھے گی۔ اور اس وقت تو شریف بھی ہو گی ——— اور صاحب مال و متاع بھی ———"

جمنا بائی نے یہ وعظ سنا، اُس کی سادہ و صاف پیشانی پر چند شکنیں پڑ گئیں ——— بغیر جواب دیئے وہ سونے چلی گئی ——— اور دوسری رات وہ خان بہادر حلیم کے آغوش میں تھی اور خان بہادر صاحب سات آسمانوں سے بھی پرے عشق و ہوس کی جنّتوں میں گلگشت کر رہے تھے۔

۴۲۰ دو اجنبی

مدراس ایکسپریس میں آدم بھی دہلی اسٹیشن پر سوار ہوا اور زبیدہ بھی دونوں سیکنڈ کلاس میں۔ ——————

شکل وصورت کے اعتبار سے آدم نہایت ہی شائستہ اور مہذب شمالی ہندستان کا تعلیم یافتہ نوجوان معلوم ہوتا تھا شکل وصورت کے اعتبار سے زبیدہ بھی ایک قتالۂ عالم اور تعلیم یافتہ دوشیزہ دکھائی دیتی تھی۔

لیکن آدم زمانے کا چھٹا چھٹایا، ٹھوکریں کھایا ہوا، منجھا ہوا اعلےٰ درجے کا فریب کار اور سوسائٹی میں ایک خطرہ تصور کیا جاتا تھا۔ کاروباری طبقوں میں اُس کی قابلیت کی ساکھ تھی لیکن لاہور، دہلی، لکھنؤ اور کلکتے میں وہ بڑی کامیابی کے ساتھ کاروباریوں کو فریب دینے کے باوجود بھی قانون کے ہاتھوں سے بچنے میں کامیاب تھا اور شمالی ہندستان میں اپنا کاروبار چلتا نہ دیکھ کر جنوبی ہند کا رُخ کر رہا تھا ——————

زبیدہ بھی ایک زیرک اور سرد و گرم چشیدہ عورت تھی اس کی عمر تیس سال ہو گی لیکن چہرے کے بھولے پن اور الھڑپن کو دیکھ کر کوئی اُسے بیس سال سے زیادہ عمر کا جانچ نہ سکتا تھا —————— وہ نوجوان عورتوں کے اغوا کرنے والے گروہ کی رکن تھی۔

تین گھنٹے دونوں نے خاموشی سے سفر جاری رکھا ——————

شام کو سات بجے آدم نے کہا "اگر آپ نامناسب نہ سمجھیں تو ذرا میرے سامان کی حفاظت کیجئے گا میں ڈائننگ کار تک جانا چاہتا ہوں۔"

"کوئی ہرج نہیں لیکن آپ ہندستانی کھانا پسند فرمائیں تو میرے ساتھ کافی کھانا موجود ہے۔"

آدم کو ہمت ہوئی "آپ کہاں تشریف لے جا رہی ہیں؟"

"بنگلور، اور آپ ——؟"

"مدراس مگر بنگلور بھی جاؤں گا ——"

"کیا کرتے ہیں آپ ——؟"

"میں! میں چمڑے کا کاروبار کرتا ہوں —— اور آپ کس سلسلے میں جا رہی ہیں؟ ——"

"میں کالج میں تعلیم پاتی ہوں۔ میڈیکل کالج بنگلور میں ——"

دونوں کھانے لگے —— ابھی تک ایک نے دوسرے کا نام تک نہ پوچھا تھا۔ ایک بڑا جنکشن آیا اور گاڑی رک گئی۔

یہ تھا۔ جھانسی، اسٹیشن پر دو پولس افسر ڈبہ میں داخل ہوئے ایک دو منٹ ٹھہر کر واپس ہو گیا دوسرا جم کر بیٹھ گیا۔ زبیدہ کے چہرے کا رنگ اڑا جا رہا تھا —— آدم، پولس افسر اور زبیدہ کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ خود کھلاڑی تھا۔ اس لئے اُسے کسی خاص راز کا افشاء ہونے کی توقع ہو گئی تھی۔ ناگوار خاموشی کو آدم نے توڑتے ہوئے زبیدہ سے کہا —— "ذرا پان دیجئے ——"

اُس نے زبیدہ کو ڈبہ میں سے پان کھاتے دیکھا تھا۔ خاموشی کے ساتھ زبیدہ نے ڈبہ بڑھا دیا۔ گاڑی چلنے کا وقت ہوا اور دوسرا افسر بھی آ کر بیٹھ گیا ——— راستے میں ان دونوں افسروں نے آدم اور زبیدہ سے کوئی بات نہ کی لیکن باہم سرگوشیوں میں مصروف رہے کبھی کبھی وہ چند کاغذ نکال کر دیکھتے اور پھر اُنہیں رکھ لیتے۔

زبیدہ کے موڈ اور رویہ میں کافی فرق آ گیا تھا۔ وہ سنبھل چکی تھی لیکن کسی قسم کا ہراس، ایک غیر محسوس خوف اس کے چہرے پر نظر آ رہا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ بظاہر وہ انتہائی صبر و سکون سے کام لے رہی ہے لیکن اُس کے اندرونہ میں ایک ہلچل ہے۔ آدم پہلے کے مقابلے میں البتہ ذرا بے تکلف ہو گیا تھا اور وہ ایسی باتیں کر رہا تھا جنہیں سنکر کبھی کبھی زبیدہ ہنس دیتی تھی ———

بینا پر گاڑی رکی اور زبیدہ غسل خانے میں چلی گئی اُس کے اُٹھتے ہی دونوں پولس افسروں نے زبیدہ کی نشست پر قبضہ کر لیا وہ اُس کے ذاتی بیگ اور سوٹ کیس کی تلاشی لے رہے تھے آدم نے انہیں روکدیا بڑی تیزی کے ساتھ،

"کیا کر رہے ہیں آپ صاحبان ———؟"

"ہمارے پاس تلاشی اور گرفتاری کا وارنٹ ہے۔"

"کس کی تلاشی اور گرفتاری ———؟"

"مس زبیدہ کی ———"

"کون ہے مس زبیدہ ——؟
جو اندر باتھ روم میں گئی ہیں ——"
آدم نے ایک قہقہہ لگایا —— "اس سے بڑھکر پولس کی حماقت اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ مس زبیدہ نہیں ہیں۔ یہ میری بیوی ڈاکٹر مسز آدم ہیں ——"

دونوں افسر حیرت زدہ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے ——"
ڈاکٹر مسز آدم ——!!" دونوں کی زبان سے نکلا اور وہ زبیدہ کا سامان چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے —— "مسز آدم! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کیا ثبوت ہے آپ کے پاس اس کا ——؟"

آدم کی تیوریاں چڑھ گئیں اُس نے نہایت تلخی کے ساتھ، اور کڑوے لہجے میں کہا —— "مجھے کوئی ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں —— میں اس کے جواب میں صرف یہ کہتا ہوں کہ آپ اپنے نام اور نمبر مجھے نوٹ کرا دیجئے۔ عدالت میں، میں یہ ثبوت پیش کروں گا کہ پولس کے ذمہ دار افسر کتنے غیر ذمہ دار ہوتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں شریفوں کی عزت اور خواتین کی عصمت محفوظ نہیں ——"

"معاف کیجئے گا۔" ایک افسر بولا۔

"معاف کیجئے گا۔" دوسرا افسر بولا۔ دونوں عدالت کا نام سن کر سہم گئے تھے۔ یہ دیکھئے فوٹو! آپ کی اہلیہ صاحبہ سے کس قدر مشابہ ہے۔ یہ عورت انتہائی زبردست عیّارہ اور عورتوں کے اغوا کرنیوالے ایک بہت

بڑے گروہ کی روحِ رواں ہے ——"

آدم نے فوٹو غور سے دیکھا وہ اب پولس افسروں کے درمیان نشست پر بیٹھا فوٹو دیکھ رہا تھا اتنے میں زبیدہ باتھ روم سے مسکراتی ہوئی نکل آئی۔

"آئیے مس زبیدہ! اغواکرنیوالے گروہ کی روحِ رواں ——"

"کیا بک رہے ہیں آپ ——؟" زبیدہ نے مُنہ بنا کر کہا۔ تصنع اُس کی پیشانی اور چہرے کے ہر خط میں نمایاں تھا آدم نے فوٹو زبیدہ کے ہاتھ میں دیدیا ——

"افوہ! واقعی مجھ سے کس قدر ملتا جلتا فوٹو ہے۔ —— لیکن آنکھوں کا فرق آپ نے نہیں دیکھا ——"

تینوں مرد فوٹو دیکھنے لگے۔ دونوں پولس افسروں کو ایسا محسوس ہوا کہ واقعی تصویر اور اصل کی آنکھوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

"معاف کیجئے گا" دونوں نے پھر دوبارا فوٹو لے لیا۔ اور گاڑی سے باہر جانے لگے۔ آدم نے اپنا کارڈ انسپکٹر کو دیدیا اس پر درج تھا

"ایم آدم امپورٹ اینڈ اکسپورٹ ڈیلرس

مدراس ——"

اور مسکرا کر کہا" انسپکٹر صاحب اگر یہ خاتون گرفتار ہو جائیں تو مجھے ضرور لکھئے' میں ان کی زیارت کروں گا ——"

"بہت بہتر ——" کہکر انسپکٹر باہر نکل گیا۔

گاڑی چل رہی تھی زبیدہ اور آدم خاموش بیٹھے تھے۔ آخر آدم نے خاموشی کا قفل توڑا۔ "کیا بات تھی۔؟ معاف کیجئے گا میری جرأت —"

"میں آپ کی احسان مند ہوں معافی کی کیا بات ہے؟"

"میری سمجھ میں اور کچھ وقت پر نہ آیا —"

"آپ نے بہت اچھا کیا، بڑے حاضر دماغ ہیں آپ —"

"شکریہ! کیا آپ کا نام دریافت کر سکتا ہوں —؟"

"ضرور! میرا نام زبیدہ ہے —" وہ مسکرانے لگی۔

"زبیدہ! تو کیا واقعی آپ ہی کا — — — — —" وہ تعجب سے زبیدہ کا منہ دیکھنے لگا۔

"جی ہاں! میرا ہی وارنٹ تھا —"

"بہت خوب! اچھا ساتھ ہوا —"

"کیا مطلب —؟"

"میں آپ کی قدر کرتا ہوں —"

"میں اب بھی آپ کا مفہوم نہیں سمجھی —"

"سمجھنے کی کوئی خاص بات نہیں۔ ہم آپ ایک ہی کشتی میں سوار ہیں —"

"تو کیا آپ بھی ۴۲۰ ہیں —" اس نے قہقہہ لگایا۔

"جی ہاں ۴۲۰ ہوں۔ مگر آپ کو ۸۴۰ سے کم نہیں سمجھتا — کاش آپ جیسا ساتھی مل جائے۔"

"کیا مشکل ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"واقعی! ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

دونوں دو تین گھنٹے تک رازدارانہ لب و لہجے میں باتیں کرتے رہے۔ شاید ایک دوسرے کو اپنی زندگی کے واقعات سنا رہا تھا ——— اٹارسی پر دونوں بجائے بنگلور اور مدراس جانے کے اتر پڑے اور دوسری گاڑی سے بمبئی روانہ ہو گئے ———

اِصُول کی خاطِر

نوٹ:- یہ افسانہ جنگ کے اس دور میں لکھا گیا۔ جب روس پر جرمنی نے حملہ نہ کیا تھا۔ اور مصنف ڈیفنس آف انڈیا رولس کے تحت جیل میں زندگی گذار رہا تھا ————

"تم نے میری زندگی عذاب میں ڈالدی ہے۔ نہ گھر کی فکر نہ بچّے کا خیال، دن رات کانگریس، کانگریس، آزادی، آزادی، مزدور اور کسان —— اور گھر بار سے لاپرواہی۔ یہ سب مصیبتیں ہی کیا ناکافی تھیں جو اب بربادی کی تکمیل کرانا چاہتے ہو۔ نہیں مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ خود دُنیا کی اس اندھی دیوانگی میں پڑ کر انسانیت کو بھی بھول گئے ہو"

یہ کہہ کر عذرا رونے لگی۔ اور شہاب "لاحول ولاقوۃ کیسے انسانوں سے پالا پڑا ہے" کہہ کر باہر نکل گیا۔

عذرا کی ساس نے جو اس چیخنے چلّانے اور رونے دھونے کی آواز سُنی تو صحن ہی میں سے چیختی پیٹتی کمرہ کی طرف دوڑی "شہاب! شہاب!! کیا بیچاری کو مار ڈالے گا۔ میں ان کی (اپنے متوفّی شوہر کی طرف اشارہ ہے) زندگی ہی میں کہا کرتی تھی کہ یہ لڑکا بڑا ضدی اور نکمّا ہے۔ خاندان بھر کا نام ڈبوئے گا۔ میں جھوٹ تھوڑا ہی کہتی تھی۔ ادھر باپ کی آنکھیں بند ہوئیں اور

ادھر اس نے ہاتھ پاؤں نکالے۔ دو ہی سال میں ساری جائداد اُڑا دی۔ دو ٹھیکرا مکان رہ گئے ہیں۔ وہ تو میرے نام تھے نہیں ان کا بھی تیا پانچا ہو جاتا کیا ہے بیٹی، کیا کہہ رہا ہے کمبخت"؟

"کچھ نہیں اماں۔ یہ تو میری قسمت کا ہی پھیر ہے۔" آنسو پوچھتی ہے۔

"ہاں بیٹی قسمت کا ہی پھیر ہے۔ پڑھایا لکھایا، ہزاروں روپیہ خرچ کر کے وکیل بنوایا، ولایت بھیجا، اکلوتا بیٹا تھا، باپ کے کیسے کیسے ارمان تھے کہ کلکٹر ہوگا، کمشنر ہوگا۔ جج بنے گا اور گھر کو روپے سے بھر دیگا۔ لیکن اس کے ولایت سے آتے ہی وہ تو اپنے اس ہونہار کے کرتوت دیکھنے کو زندہ نہ رہے اور ہمیں ساری مصیبت جھیلنے کو چھوڑ گئے۔"

"بیٹی! تیری شادی میں نے کن ارمانوں سے کی تھی، سمجھتی تھی کہ شاید شادی اس کو سنبھال دے۔ مگر ہائے ری قسمت۔ اس کو ایسا جنون.... "ہندوستان کی آزادی" کا چڑھا ہے جو اُتارے نہیں اُترتا۔ دن رات اسی غم میں مارا مارا پھرتا ہے۔ خدا جانے ہندوستان کی آزادی کیا ہوتی ہے اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ جب دیکھو جب اس کی زبان پر امیر اور غریب کا نام ہے۔ جب دیکھو کسان اور مزدور کا رونا ہے۔ چار چار دن غائب۔ پوچھو تو کسان کانفرنس میں گیا تھا، مزدور سبھا میں لگا ہوا تھا۔ بیٹی میں نے تیری قسمت پھوڑ دی۔ خدا اس مہاتما گاندھی کا ستیاناس کر دے۔ جس نے میرے لال پر جادو کیا ہے۔ نہ جانے یہ کیسا جن ہے۔"

اتنا کہہ کر شہاب کی بوڑھی ماں کا دل بھر آیا۔ وہ زیادہ نہ کہہ سکی اور عذرا

کو گلے لگا کر رونے لگی۔ جب ذرا دماغ کا بوجھ ہلکا ہوا تو اس نے پھر کہنا شروع کیا:۔

"بیٹی! میں خدا کی اور تیری دونوں کی گنہگار ہوں۔ تیرا باپ شادی پر بالکل تیار نہ تھا۔ لیکن چھوٹا بھائی ہے میری خفگی نہ چاہتا تھا۔ راضی ہو گیا وہ پہلے ہی سمجھتا تھا۔ اور جب میں اس سے کہتی تھی کہ شادی کر دو۔ بچپن سے دونوں کی نسبت اور منگنی پکّی ہو چکی ہے۔ تو وہ صاف کہدیتا کہ بہن! شہاب کا مستقبل اچھا نظر نہیں آتا۔ وہ حکومت کے خلاف ولایت سے بڑے بڑے خیالات لے کر آیا ہے۔ اگرچہ اس کی قابلیت اور علمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ لیکن اب وہ گھر بار بیوی بچّوں کے لائق نہیں رہا۔ ہائے میری ضد نے تیری قسمت بھی پھوڑ دی"۔ یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔

عذرا نے ساس کو زیادہ غمگین دیکھ کر سمجھانا شروع کیا۔ اسے اپنا غم بوڑھی پھوپھی کے اس صدمے کے سامنے ہیچ نظر آتا تھا۔ اتنے میں پالنے میں سے بچّے کے رونے کی آواز آئی۔ ساس اور بہو دونوں رونا دھونا بھولکر اُدھر متوجہ ہو گئیں۔ عذرا بچی کو گود میں لیکر ٹہلنے لگی۔ ساس چپ سنّاٹے میں کچھ سوچنے لگی۔

"بیٹی!" ـــــ تھوڑے سے وقفے کے بعد اس نے پھر کہا "کیا بات ہے۔ تو آج کیسے رو رہی تھی۔ تجھ جیسی صابر و شاکر کو یہ ظالم رُلایا کرتا ہے!"

"کچھ نہیں پھوپھی۔ رونا تو عمر بھر کا ہے۔ آنکھ سے آنسو تو اسی وقت نکل سکتے ہیں جب کوئی تازہ چوٹ زخم دل پر لگائی جائے"۔

"تو آج اس نے تجھ سے کہا کیا تھا؟"

"آج نہیں، وہ تو ایک مہینہ ہوا جب سے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کی کوئی پارٹی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی یا کیا۔ اس کو اس نازک زمانے میں پوشیدہ طور پر کام کرنا ہے۔ کیونکہ ملک بھر میں وہ ناجائز قرار دیدی گئی ہے۔ اس لئے اب اُس کے سب آدمی اپنے گھر میں جمع ہوا کریں گے۔ چُھپ چُھپ کر ____"

"تو بیٹی اس میں کیا نقصان ہے، اب بھی تو رات دن باہر کے کمرے میں غل غپاڑہ رہتا ہے۔"

"یہ بات یہیں تک نہیں ہے پھوپھی بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے سب دوستوں سے پردہ توڑ دوں بلکہ بالکل ہی پردہ توڑ دوں۔ انگریزی تو میں نے پڑھی نہیں ہے۔ ابّا جان اس کے بہت خلاف ہیں۔ لیکن ان کا خیال ہے کہ ان کے دوست انگریزی پڑھا لیں گے۔ اس کے بعد میں بھی ان کی پارٹی میں لے لی جاؤں گی۔ وہی کمیونسٹ پارٹی ہے یا کیا بلا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں پارٹی کے کاموں کے لئے بہت مفید ہو سکتی ہوں۔"

"خدا بچائے۔ میں نے بچپن ہی سے کتنا کتنا روکنا چاہا کہ انگریزی نہ پڑھاؤ۔ مگر باپ تھے اُس کے فوجی ٹرّے نہ مانے۔ پھر ولایت بھیج کر تو نہ صرف ساری عمر کی کمائی گنوائی لڑکے کو بھی ہاتھ سے کھو دیا۔ توبہ۔ توبہ۔ خدا بچائے۔ میں کچھ بھی نہیں سمجھی کہ وہ تیرا کیا کرنا چاہتا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں پھوپھی! وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں بھی اُن کی طرح انگریزی

پڑھ لوں۔ گھر کے کام کاج کی فکر نہ کروں۔ اور اُن ہی کی طرح دیوانی ہو کر "ہندوستان کی آزادی" میں لگ جاؤں۔ پردہ اور روزہ نماز سب چھوڑ چھاڑ دوں۔"

"خدا کی مار۔ لعنت ہو اس شیطان گاندھی پر جس نے شریف گھرانوں کا ستیاناس مارا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ اس ہندوستان کی آزادی کے قصے میں لوگوں کو جیل میں بھی تو بھیجتا ہے۔ خدا نہ کرے یہ دن مجھے دیکھنا پڑے۔" دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر "الٰہی شہاب کو جیل سے بچانا کیسی بدنامی ہوگی۔"

"اور ہاں پھوپی جان آپ نے یاد دلا دیا جیل کا قصہ۔ وہ کہتے تھے کہ یہ سال اُن کے آدمیوں کیلئے بڑا سخت سال ہے۔ حکومت چن چن کر لڑائی کی وجہ سے انھیں پکڑ رہی ہے۔ اور وہ چھپتے پھرتے ہیں۔ اس لئے اسی سال کے اندر اندر انھیں کم سے کم ساٹھ ہزار روپیہ اس مقصد کے لئے جمع کر لینا چاہئے کہ ضرورت کے وقت ان کی پارٹی کے آدمی اسلحہ خرید کر اپنی حفاظت کر سکیں۔ اور ہندوستان سے باہر بھاگ کر جا سکیں۔"

"بیٹی! میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔"

"ان کی باتیں سب اچھی طرح تو میری سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ لیکن کچھ مطلب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری پولس ان کے دوستوں کو اور "ہندوستان کی آزادی" والوں کو جیل بھیجنا چاہتی ہے۔ وہ تو کہتے ہیں کمیونسٹوں کو۔ مگر میں سمجھی ہی نہیں کہ یہ کمیونسٹ کیا ہوتے ہیں!"

"یا الٰہی بچانا اُسے۔ بیٹا آج اپنے باپ حیدر کو ضرور بلوانا۔ میری بات تو وہ سنتا نہیں۔ شاید حیدر کے کہنے سننے سے کچھ مان جائے۔ وہ سسر بھی ہے اور ماموں بھی کچھ نہ کچھ لحاظ تو آ ہی جائیگا۔

شہاب کے اوپر کے کمرے میں دس پندرہ آدمی جمع ہیں۔ باہر کے کمرے میں ایک شریف صورت نوجوان سوٹ پوش بیٹھے ہیں۔ اور جو لوگ آتے جاتے ہیں انھیں خاموشی اور آہستگی کے ساتھ اوپر پہنچاتے جاتے ہیں اوپر کمرے میں ایک بڑی سی میز بیچ میں پڑی ہوئی ہے۔ اور آس پاس کرسیاں بچھی ہیں جن پر آنے والے بیٹھتے جاتے ہیں۔ آخر کار آنے والوں کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اور شہاب نے میز کے ایک سرے پر کھڑے ہو کر انگریزی میں دوسرے آدمیوں کو مخاطب کر کے کہا "ساتھیو! ہم نے کافی احتیاط سے آج کے اجتماع کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ہماری دو تین ایسی کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ لیکن ایسا یقین ہے کہ آج پولس کو ہمارے اس جلسہ کا سراغ نہ مل سکے گا۔ اس لئے ہمیں اپنی کارروائی باطمینان شروع کرنا چاہیئے"

ایک کھادی پوش نوجوان اٹھے اور زمانہ جنگ میں اپنی تحریک کی رفتار پر تبصرہ کرنے لگے۔

"ہم نے کوشش کی کہ ہم کھل کر سامنے آئیں۔ لیکن زمانہ کی رفتار ہماری طاقت کے خلاف ہے۔ ایک طرف تو بدیشی سامراج کا سیاسی اقتدار ہمیں کچل رہا ہے۔ دوسری طرف خود ہماری قومی تحریک جو ہمارے سرمایہ داروں

کے بل بوتے پر چل رہی ہے۔ صنعتی مزدوروں سے ایسے زمانے میں جبکہ صنعتیں بے انتہا فائدہ بخش ثابت ہو رہی ہیں مکمّل خاموشی کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اور کسی ایسے قدم کو جو مزدور اپنے معاشی مفاد کے لئے اٹھانا چاہیں پیچھے ہٹانے میں پوری سخت گیری کے ساتھ تشدد کا ساتھ دیتی ہے۔ اور خود ہم پر یہ الزام لگاتی ہے کہ ہم عدم تشدد کے مخالف اور تشدد کے حامی ہیں۔ ساتھیو!"

سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی آواز سُنائی دی۔ سب حیرت سے ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے۔ اتنے میں مسٹر حیدر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولس جو شہاب کے سُسر اور ماموں تھے کمرے میں باقاعدہ وردی پہنے ہوئے داخل ہوئے۔ پولس کی وردی دیکھ کر ہر ایک اپنی نشست پر چوکنا ہو گیا۔ اور سوٹ پوش نوجوان نے اپنی جیب میں سے ریوالور نکال کر میز پوش کے نیچے چھپا لیا۔ شہاب نے نوجوان کو مخاطب کر کے کہا "گھوش! خبردار! یہ پولس افسر بھی ہیں اور میرے سُسر بھی ہیں۔ ان سے پوچھنے دو کہ یہاں آنے کی تکلیف کیوں گوارا فرمائی ہے؟"

"میں اسی مقصد کے لئے تعینات کیا گیا تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کی جانچ کروں۔ اور اگر وہ خفیہ جلسے کرے تو اپنے اطمینان کے بعد شرکاءِ جلسہ کو گرفتار کر لوں۔ لیکن یہ گھر میری بہن، میری بیٹی، میرے بھانجے اور میرے داماد کا بھی ہے۔ اس لئے میں اپنے فرائض کی بجا آوری سے پہلے ذاتی طور پر مسٹر شہاب سے آپ صاحبان کے مواجہ میں کچھ خانگی امور کے

متعلق گفتگو بھی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا مسٹر شہاب آپ تیار ہیں؟ —
مسٹر حیدر سوال کرنے کے بعد شہاب کی طرف دیکھنے لگے۔

"ماموں جان میں جانتا ہوں کہ آپ کیا گفتگو کریں گے۔ پچھلے چند دن میں ہم آپ گھنٹوں خانگی معاملات پر گفتگو کر چکے ہیں۔ آپ اپنے فرائض انجام دیں"۔

"تمہاری اس ضد کے باوجود بھی میں پھر ایک موقع ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتا —"

"حضرات! یہ میرے داماد ہیں، اپنی شادی کے بعد سے اب تک انھوں نے اپنی شریکِ حیات کے مسرت وغم میں کوئی حصہ نہیں لیا حالانکہ جب شادی کی تجویز ہوئی اس وقت بھی یہ عاقل و بالغ اور سمجھدار انسان تھے ان کی تعلیم بھی اعلیٰ ترین تعلیم تھی۔ یہ یورپ سے واپس آچکے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے ارادوں کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ اور خاموشی کے ساتھ اس ازدواجی زندگی کو قبول کر لیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ ازدواجی زندگی کی تمام سوشل، اخلاقی اور قانونی ذمہ داریاں قبول کرنے کے لئے آمادہ تھے"۔

"میں اب بھی آمادہ ہوں"۔ تڑخ کر شہاب نے جواب دیا۔

"بات نہ کاٹو — تو حضرات شادی کے بعد سے انہوں نے اس قسم کی کسی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا۔ نہ صرف میری لڑکی کی زندگی مصیبت میں ہے بلکہ اپنی بوڑھی ماں کو بھی انہوں نے زندگی سے عاجز کر دیا ہے۔ انہوں نے انتہائی ظلم یہ کیا کہ اپنی بیس پچیس ہزار روپے کی جائداد

ٹھکانے لگا کر نہ صرف اپنی زندگی کو تباہ کیا بلکہ اپنی بیوی، اپنی ماں اور ایک معصوم بچی کی زندگی کو تلخ بنا دیا ہے۔"

"میں اس وقت ان کے آئیڈیل یا ان کے اصولوں سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ نہ مجھے ان سے کوئی سروکار ہے۔ کیونکہ انہوں نے میری بیٹی کی زندگی اور مستقبل کو سوچے سمجھے بغیر اُسے مصیبت کا شکار بنانے میں اپنے اصولوں کو اُس وقت بالکل پیشِ نظر نہیں رکھا تھا۔"

"اس کے باوجود گذشتہ دو سال میں، میں نے بار بار ان کے لئے حکومت سے معافی کی کوشش کی۔ اور بار بار حکومت نے انھیں معاف کر دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ لیکن یہ تیار نہ ہوئے۔ اور سول سروس کا کوئی عہدہ انھوں نے قبول نہیں کیا۔ اور اب آخری ظلم یہ ہے کہ یہ اپنی بیوی سے نہایت سنجیدگی کے ساتھ ایک عجیب قسم کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ بھی ان کے ساتھ ان کی سیاسی سرگرمیوں میں شریک ہو اور اپنا نصب العین اپنی تباہی کو بنائے

"میں سرکار کا وفادار قدامت پسند انسان ہوں اور سوسائٹی کی موجودہ حالت میں کسی تبدیلی کا سخت مخالف ہوں۔ وہ میری بیٹی ہے اور میری تربیت کے ماتحت یہ اُس کے بس کی بات نہیں۔ لیکن ان کی یہ خواہش پورے گھر کی مخالفت کے باوجود دیوانگی کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ اس لئے میں اپنا اور ان کا معاملہ آپ صاحبان کے سامنے انصاف حاصل کرنے کے لئے پیش کرتا ہوں۔ اسی کے ساتھ مجھے آخری بار ان سے یہ بھی کہنا ہے کہ اگر یہ میری تجویز قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں تو انہیں اپنی بیوی کو آزاد کر دینا چاہئے

اور اس سے علیحدگی اختیار کر لینا چاہئے۔"

"میں تیار ہوں۔" شہاب نے جواب دیا۔

لیکن سب خاموش رہے۔ وہ سب ششش و پنج میں پڑ گئے تھے۔

"اچھا تو اس طلاق نامے پر دستخط کرو۔"

پولس افسر نے کاغذ میز پر ڈال دیا۔ شہاب کی طرف بڑھایا۔ اور بغیر کسی تامل کے، بغیر کچھ دیکھے، جیب سے قلم نکال کر اس نے دستخط کر دیئے۔

"ٹھیک ہے۔" پولس افسر نے کہا۔ "اب میری بچی آزاد ہے۔ اور تم پر اس کا مہر واجب الادا ہے۔ گیارہ ہزار روپیہ۔ اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی"؟

"مجھے نہیں معلوم۔ میرے پاس اب روپیہ، جائداد وغیرہ کچھ نہیں۔" شہاب نے غمگین لہجہ میں جواب دیا۔

"خیر، اس کا فیصلہ ہوتا رہے گا۔ لیکن اپنی ڈیڑھ سالہ بچی کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ ہم اس کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں۔"

شہاب جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ برابر کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور عذرا کے چیخ چیخ کر رونے کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہی تھی: "ابا جان! یہ آپ نے کیا کیا، میں آپ کو منع کرتی رہی لیکن آپ نے نہ مانا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے اپنی ساری زندگی انھیں کے ساتھ گذارنا ہے۔ اب میں ان سے علیحدہ ہونا نہیں چاہتی۔ آپ اس کاغذ کو پھاڑ ڈالئے ——— ہائے میری قسمت، ہائے میری بچی۔" وہ پھر رونے لگی۔

عذرا، تمہیں شرم نہیں آتی، یہاں اتنے مرد اور سب کے سب نامحرم بیٹھے ہوئے ہیں۔ جاؤ گھر میں جا کر بیٹھو۔" عذرا کے باپ نے ڈانٹ کر کہا۔ وہ ننگے سر گھر سے باہر نکل آئی تھی۔ اور اس کے چہرے پر اضطراب اور اور پریشان حواسی گہری تکلیف کا پتہ دے رہی تھی۔

"نہیں ابا جان رہنے دیجئے۔ میری قسمت انہی کے ساتھ بننے بگڑنے دیجئے۔ وہ جس طرح چاہیں گے میں اُن کے ساتھ رہوں گی اور خوش رہونگی۔" وہ اب بھی زار و قطار رو رہی تھی۔

پولس افسر غصے سے سُرخ ہو گیا" بدذات، بے حیا لڑکی! تیرا شوہر تجھے طلاق دے چکا۔ دور ہو سامنے سے ——— اب کچھ نہیں ہو سکتا"

"میں اس طلاقنامے کو چاک کر کے عذرا کو واپس لے سکتا ہوں آپ اس پر کوئی زیادتی نہیں کر سکتے"۔ شہاب نے چلّا کر کہا۔ اور طلاقنامہ کی طرف جھپٹ کر ہاتھ بڑھایا جو اب تک میز پر پڑا ہوا تھا۔ لیکن کاغذ چشم زدن میں پولس افسر کے قبضہ میں تھا۔ اس نے سنجید گی سے کہا۔

"یہ لڑکی کی وقتی تکلیف اور ہنگامی جذبات پیدا ہونے کی وجہ ہے وہ تمہاری شریکِ زندگی رہ کر کبھی خوش نہیں رہ سکتی۔ ہاں اپنی بچّی کے لئے کیا انتظام کرتے ہو؟"

شہاب خاموش تھا۔ مگر اس پر شدید تاثرات طاری تھے۔ کوئی ماہرِ نفسیات بھی اس وقت شہاب کی نفسی کیفیتوں کا، ایسے ملے جلے احساسات کا اندازہ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ کمرے میں ہوائے

عذرا کی ہچکیوں کے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہر شخص مہر بلب تھا کہ اتنے میں برابر والے کمرے سے ایک بوڑھی عورت کی آواز کچھ کہتی سُنائی دی۔ یہ شہاب کی ماں کی آواز تھی۔ جو انتہائی درد و کرب کے عالم میں کہہ رہی تھی "بھیّا حیدر، حیدر! بس اتنا غصّہ کافی ہے۔ شہاب مان گیا۔ بس اب رہنے دے"۔

"افسوس! بہن جان! قصہ ہی ختم ہو گیا۔ یہ سب جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں اپنے سینے میں پتھر رکھتے ہیں۔ خیر اندر جاؤ"۔ مسٹر حیدر نے کہا۔

کمرے کا ماحول سخت ڈرامائی ہو چکا تھا۔ شہاب کے چہرے پر زردی سُرخی اور سفیدی باری باری سے رنگ لا رہی تھی۔ "گھوش! ریوالور تیار" نوجوان کے نتھنے پھول گئے تھے۔ اور وہ بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ اچھا اب آپ کیا چاہتے ہیں؟" شہاب نے پوچھا۔

"ہاں اب مجھے اپنے ناخوشگوار فرائض انجام دینے ہیں۔ اچھا مسٹر شہاب، مسٹر گھوش، مسٹر مکرجی، مسٹر رام ناتھ، مسٹر سنبھل! میں آپ پانچ صاحبان کو حضور ملک معظم کی قانونی حکومت کے خلاف جنگ کرنے اور اسلحہ استعمال یا ایسا کرنے کی کوشش کے جُرم میں گرفتار کرتا ہوں۔ باقی صاحبان بھی ٹھہریں۔ میں جامہ تلاشی کے بعد اجازت دوں گا کہ وہ تشریف لے جائیں"۔ یہ کہہ کر پولیس افسر نے سیٹی بجائی۔

گھر کے اندر، صحن میں، سڑک پر اور زینے پر دھما دھم قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ یکایک آس پاس بھگدڑ مچ گئی ہے

کمرے کے اندر عورتیں سہم کر رہ گئیں۔ رونے دھونے کی آواز بند ہوگئی زینہ پر آدمیوں کے چڑھنے کی آوازیں آنے لگیں۔

یکایک میز پوش میں ایک سرسراہٹ ہوئی۔ گھوش کی کرسی پیچھے ہٹی۔ وہ تن کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے ریوالور پولس افسر کی طرف تان کر کہا:-

"مسٹر پولس افسر! آپ اپنے تمام ذاتی اور صفاتی فرائض انجام دے چکے۔ اب میں اپنا فرض انجام دیتا ہوں۔"

فائر کی دو پیہم آوازیں آئیں۔ دونوں گولیاں تین تین انچ کے فاصلہ سے پولس افسر کے سینے میں پیوست ہوگئیں۔ بھاری لاش دھڑام سے فرش پر گری۔ اور گرم خون کے دو فوارے سینے سے جاری ہوگئے فرش خون سے سرخ ہوگیا۔

"کم بخت، وقت سے پہلے تمام پروگرام ملیامیٹ کر دیا۔ اب ہم میں سے کوئی آزاد نہیں رہ سکتا۔"

ریوالور کی آواز سے پولس چوکنا ہوگئی۔ آٹھ دس انسپکٹر، سب انسپکٹر اور چھوٹے عہدہ دار ریوالور ہاتھوں میں لئے اندر داخل ہوئے۔ ایک دراز قامت فربہ اندام لانبی مونچھوں والے انسپکٹر نے بھاری آواز سے کہا:- "تم سب لوگ گرفتار کئے جاتے ہو۔ ہاتھ اونچے کر لو۔ حکم نہ ماننے والے کو گولی مار دی جائیگی۔"

تھوڑی ہی دیر میں کمشنر، سپرنٹنڈنٹ اور بہت سے پولس افسر

آپہنچے۔ اور اٹھارہ آدمیوں کو مع شہاب کے گرفتار کر لیا گیا۔

دو سال مقدمہ چلنے کے بعد گھوش کو پھانسی کی سزا دی گئی، اُس نے اقبالِ جرم کیا تھا۔ شہاب اور اس کے دو ساتھیوں کو ناجائز اسلحہ فراہم کرنے، ملک معظم کی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کی سازش کرنے اور پولس افسروں کو قتل کرنے کا ارادہ رکھنے کے جرم میں حبس دوام کی سزائیں ہوئیں۔ اس کے باقی ماندہ ساتھیوں میں سے کسی کو سات سال، کسی کو چار سال اور کسی کو دو سال۔

طلاق نامے کی رو سے عذرا کی طلاق صحیح قرار دی گئی۔ اور عین اُسی دن جو شہاب کی سزایابی کا دن تھا، عذرا اور ایک "معقول" صاحب جائداد پولس انسپکٹر کا عقد ثانی ہو گیا۔ اب وہ پُرسکون زندگی بسر کر رہی تھی۔

لیکن اکثر و بیشتر آدھی راتوں کے اندھیرے میں جھلملاتے ہوئے تاروں کے سوا کوئی نہ محسوس کر سکا کہ عذرا اپنی آنکھوں کے راستے بے شمار گوہر آبدار لٹا چکی ہے ——— کسی نے اس کی نوائے درد خدائے تاریکی کے سوا نہ سنی۔ شاید اب اس کا امتحان لیا جا رہا تھا ———

عذرا کا دوسرا شوہر کبھی کبھی عذرا کو ملول دیکھ کر کبھی ازراہ ہمدردی کبھی ازراہِ تمسخر یہ ضرور پوچھا کرتا ہے کہ "کیوں تمہیں شہاب تو یاد نہیں آتا؟" اور پھر خود ہی جواب دیدیتا ہے کہ ——— "ضرور یاد آتا ہو گا۔ بڑا اچھا آدمی تھا۔ لیکن اصول کی پاسداری کرنا بھی اس کی طرح حماقت ہے!"

عالمِ یاس

جنگ تو جنگ ٹھہری، کسی کی خواہش سے تو امن میں تبدیل ہو نہیں سکتی۔ مقصود کی خواہش تھی کہ امن کا زمانہ آجائے —— —— مگر مقصود بھی تو معمولی آدمی تھا —— بالکل معمولی آدمی، کلرک!

اُس نے سوچا کہ "اگر میں ہٹلر ہوتا۔ تو جنگ کے اس تماشے سے میری طبیعت سیر ہو چکی ہوتی اور میں جرمن قوم کو حکم دیتا کہ لڑائی بند کردو۔"

لیکن اس نے یہ نہیں سوچا کہ اگر وہ ہٹلر ہوتا تو کبھی یہ نہ سوچتا کہ گرانی الاؤنس تین سو فیصدی بڑھنا چاہیئے کیونکہ سو روپیہ میں اس کی گذر بسر نہیں ہوتی۔ نہ وہ یہ سوچتا کہ اگر اس رفتار سے قرضہ بڑھتا رہا تو اُسے اپنا ذاتی مکان بھی فروخت کردینا پڑے گا —— اور اسی لئے اُسے ہٹلر بننے کی تمنا تھی ——

پہلے وہ ہٹلر کی جیت چاہتا تھا۔ کیونکہ ہٹلر جیت رہا تھا۔ جب ہٹلر نے ہارنا شروع کیا۔ تو اُس نے سوچا کہ یہ تو معاملہ طول پکڑ گیا کیونکہ اگر ہارتے ہارتے ایک عرصہ کے بعد جیتنے کے قابل ہو تو پھر اتنی ہی مدت زیادہ صرف ہوگی اور ہٹلر لڑائی کو بڑھائے چلا جائیگا۔ اس لئے اس نے

اب ہٹلر کی ہار اپنی رائے بنالی۔ اور یہ رائے اس تیزی سے ترقی پا گئی کہ وہ اسی مہینے، بلکہ اسی ہفتے۔ اسی لمحے ہٹلر کو ہارا ہوا دیکھنا چاہتا تھا کیونکہ لڑائی جتنی لمبی کھنچ رہی تھی اُس کے مکان کی فروخت کا زمانہ زیادہ قریب آ رہا تھا ——————

مجبور ہو کر اُس نے دو ماہ ہٹلر کی آخری شکست کے مقرر کئے اور انتظار کرنے لگا۔ وہ ہٹلر کے خلاف شدید پروپیگنڈا بھی کرتا شائد اُسے اس خیال سے تسکین ہوتی ہو کہ وہ جتنا پروپیگنڈا کریگا ہٹلر پر اس کا اثر پڑے گا ممکن ہے وہ جھوٹ بھی نہ سمجھتا ہو ——————

لیکن آخر کار دو مہینے گذر گئے اور ہٹلر کے مرنے کی خبر کے ساتھ اس کا ایک فرمان بھی شائع ہوا ——————

موت کی خبر اور فرمان کی اشاعت دونوں نے مل کر اُسے گھن چکّر بنا دیا۔ اب مکان بیچے بغیر چارہ کار نہ تھا۔ پہلے پانچ ہزار لگے تھے اور اس نے فروخت سے انکار کر دیا تھا۔ خاتمۂ جنگ سے مایوسی نے اُسے آخر کار آمادہ کر دیا کوئی بڑا قدم اٹھانے کے لئے ——————

عالم یاس میں وہ قدم اٹھ گیا اور پانچ ہزار کا مکان سوا چار ہزار میں بک گیا۔ لیکن اب مقصود کو خاتمۂ جنگ کی پرواہ نہیں تھی —————— دس روپیہ مکان کا کرایہ ایک سال دینے کے بعد بھی وہ اگر قاعدے سے چلے تو چار برس یا تین برس بغیر گرانی الاونس بلے بھی دھکیل سکتا ہے۔

اس نے دھکانا شروع کر دیا۔ اور آج کل وہ چور بازار سے خرید کر کپڑا بھی بنوا رہا ہے اور کھانا بھی معقول کھا رہا ہے۔ کبھی کبھی مکان کو یاد کر کے وہ یہ ضرور کہہ لیتا ہے کہ ——————

—— مفلسی تیرا ہی آسرا ——————

فلسفی دیوانہ

"اوہ! رات کتنی تاریک ہے! کسی رات کی تاریکی نے مجھے اس طرح خوفزدہ نہیں کیا جتنا میری ناقابلِ فہم ہستی مجھے ڈرا رہی ہے" ——

فلسفی دیوانہ کی ایک دن کی ڈائری ان اوراق سے شروع ہوئی اور اس طرح اُس کا تسلسل قائم رہا۔ ——

عورت آخر حسین کیوں ہوتی ہے؟ یہ چڑیاں اُڑ اُڑ کر کہاں جا رہی ہیں؟ بہت اچھا ہوتا اگر میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا —— اس میں بھی کوئی ہرج نہیں تھا کہ محض ایک پتھر ہوتا جس کی آنکھیں ہوتی ہیں نہ کان —— نہ خیال نہ فلسفہ، نہ منطق، دن بھر میں نے ہسپتال کی تعمیر کی خاطر زخمیوں کے فائدے کے لئے پتھر ڈھوئے شام کو اپنی سب دن بھر کی کمائی خیرات کر دی ——

بھوک کا فلسفہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں اسی مسئلے پر غور کرتے کرتے سونے کے لئے لیٹتا ہوں۔ ایک فلسفی نے کہا تھا کہ اگر سوتے وقت ایک آدمی خیال کرے کہ گھڑ دوڑ ہو رہی ہے اور ہزار ہا گھوڑے ایک کے پیچھے دوسرا چلا جا رہا ہے تو اُس کا دماغ چکرا جاتا ہے —— میں بھی یہی سوچنا شروع کرتا ہوں! کمیت! اسمند! تازی، مشکی ...... یا... ... بو.... بو!.....

آج کی تاریخ میں ڈائری پر آگے کچھ درج نہیں تھا۔

تانہ بخشد خدائے بخشندہ!

ایک نام نہاد عالم جو محض برائے نام عالم تھا، پچیس سال تک ایک مسجد میں طلباء کو درس دیتا رہا لیکن اس کا ایک شاگرد بھی ایسا پیدا نہ ہو سکا جو کچھ نام یا کام کر جاتا ——————

—— جیسی روح ویسے فرشتے ——

مگر عالم کو روٹیاں کھانے والے مُلّا کے نام سے کافی شہرت حاصل ہوئی۔ پچیس برس کے بعد مُلّا مر گیا اور کسی کو بھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ شہر کا بہترین جلد ساز تھا جس کی بنائی ہوئی جلدیں سارے ملک میں مقبولیت حاصل کر چکی تھیں اور جو راتوں کو چھپ چھپ کر جلد سازی کا کام کرتا تھا۔ تاکہ لوگ اُسے بجائے جیّد عالم کے کہیں جلد ساز نہ سمجھ لیں۔

اس کا ایک شاگرد جو پیشہ ور جلد ساز تھا اور جس کی جلد سازی نہایت بھونڈی تھی اُس کا جانشین بنایا گیا سیکڑوں شاگردوں میں وہ سب سے زیادہ ہشیار تھا۔ لیکن جلد سازوں میں اُس کی شہرت انتہائی خراب تھی۔ وہ ذہین تھا لیکن فن کاری میں ہاتھ کا کچّا ——————

مگر وہ دماغ کو کام میں لانے کے بجائے ہاتھ کی صفائی کو اصل جوہر سمجھتا تھا ——————

بیس برس کے بعد اُسے یہ احساس ہو گیا کہ جلد ساز مشہور

ہونے کے بجائے ایک جید عالم مشہور ہونے کی کوشش کرنی چاہیے اور پانچ برس میں اُس کے علم و فضل کا چرچا سارے ملک میں پھیل گیا ——————

پچیس برس کے بعد جب وہ مرا تو وہ ایک زبردست اور فاضل کامل مولوی اور عالم سمجھا گیا لیکن ایک ناکام جلد ساز ——— !

بدصورتی

جوان لڑکی بدصورت تھی، ماں فاقہ کر رہی تھی اور اس کے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن بھی بھوک سے بیتاب تھے ———

پرسوں باپ مرا تھا، مزدور کی موت کے دوسرے دن ہی اس کے گھر میں کھانے کو نہیں ہوتا۔

ماں نے بدصورت لڑکی سے جو چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی کہا "مزدوری کر ———"

لڑکی نے جواب دیا "یہ نہیں ہو سکتا۔ میں تعلیم یافتہ ہوں"

ماں نے کہا کہ "محلّے والوں کے بچوں کو پڑھا ———"

بیٹی نے کہا "میں کسی کے سامنے نہ ہاتھ پھیلاتی نہ خوشامد کرتی .... محلہ والوں کو خود بچے بھیجنا چاہئیں ———"

بدصورت بیٹی نے مزدوری نہیں کی ——— محلہ والوں نے بچے نہیں بھیجے ایک مہینے میں گھر کے صندوق، بڑے برتن اور بکری بک گئی ——— دوسرے مہینے میں بکنے کے لئے بھی کچھ نہ تھا ———

ماں کا جوان بھائی اور بدصورت لڑکی کا خوبصورت ماموں آیا اور لڑکی کو لیجانے کے واسطے تیار ہو گیا ——— اس کے محلے میں کچھ بچّے تھے جنہیں وہ پڑھا کر سولہ روپے مہینہ کما سکتی تھی ———

ڈیڑھ مہینے کے بعد لڑکی آئی ـــــــ اس نے ماں کو بتایا کہ وہ حاملہ ہے۔ مگر "بیس روپیہ" کا نوٹ نکال کر دیا ـــــــــــ ماں بولی۔

"بیس روپیہ کا نوٹ میں نے نہیں سنا ـــــــــــ"

لڑکی نے جواب دیا "تمہیں دنیا کی کچھ خبر نہیں ـــــ"

شام کو بھٹیار خانے کے مالک نے پولس مین کو بلا کر ماں کو گرفتار کرا دیا۔ وہ بیس روپیہ کی قیمت کا لاٹری ٹکٹ نوٹ بنا کر چلا رہی تھی....

ڈیڑھ مہینے بدصورت، نوجوان ... کنواری بھانجی کو داشتہ بنا کر رکھنے کا یہ معاوضہ نوجوان خوبصورت شادی شدہ ماموں نے دیا ـــــــــ

رعایا کا مطالبہ

کہتے ہیں کہ ایک دن بادشاہِ وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار اُڑا چلا جا رہا تھا۔ یکایک اس کے گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ بادشاہ کے چاروں طرف سے "بادشاہ زندہ باد" کے نعرے بلند ہوئے ——— گروہ میں سے ایک غریب مزدور نے بھی یہ نعرے سنے لیکن اُسے پسند نہ آئے وہ محنت سے چور چور ہو رہا تھا۔ اُس نے جب یہ آواز سُنی تو دم لینے کھڑا ہو گیا ——— تھوڑی دیر بادشاہ کو وہ دیکھتا رہا کہ "کہیں یہ قوم کسی دوسرے قسم کی مخلوق تو نہیں"۔ یعنی ممکن ہے اس کے چار ہاتھ ہوں تین سر، دو چار ناک کان ...... لیکن وہ اسے بالکل اپنی طرح دکھائی دیا ——— ہمّت کر کے وہ آگے بڑھا اور اس نے کہا:۔

"جہاں دار! تیری حکومت اور ریاست میں اندھیر ہے ——— !کنٹرول کا نام ہے لیکن اقلیم بھر میں کوئی چیز کنٹرول کے دام نہیں ملتی ——— میں صبح سے شام تک مزدوری کرتا ہوں تو دس بارہ آنے مشکل سے ملتے ہیں اور تو ——— ؟ تو بھی تو میری ہی طرح کا انسان ہے۔ اور تیرے یہ مشیر اور مقرب اور درباری ——— یہ عیش کر رہے ہیں اور میں بھوکا مر رہا ہوں میرے ساتھ

انصاف کر ــــــــــــــــــــ"

ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

ایک تماش بین اپاہج بھی موجود تھا۔ مزدور کی باتیں سن کر اس کی ہمت بھی بندھی۔ اپنی بیساکھی کا سہارا لیکر اس نے بھی للکارا:۔

"زخمی دلوں پر نمک چھڑکنے والے! تیری سلطنت میں بڑا غدر ہے۔ تو جن کے ہاتھوں ہمیں بھیک پہنچاتا ہے وہ موٹے فقیر اُس بھیک کو خود ہضم کر جاتے ہیں۔ اور ہمیں منہ تکتا چھوڑ دیتے ہیں۔ اس خیانت کے مجرم ہونے پر بھی وہ تیری بادشاہت کے تاج کا ہیرا بنے ہوئے ہیں۔ اور تیری بدولت رنگ رلیاں مناتے ہیں ــــــــــــ

"تیری حکومت کس کام کی جب تو معذور کے کام بھی نہ آئے۔ انصاف کر انصاف ــــــــــــ"

ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

مظلوم کا دل پھپھولا ہوتا ہے پھوٹ کر بہہ نکلا اُس نے تو بڑھ کر بادشاہ کا دامن ہی پکڑ لیا ــــــــــــ

"تجھے لوگ رحمدل، منکسر المزاج اور عدل گستر کہتے ہیں۔ وہی لوگ جو تیرے آس پاس رہتے ہیں، مگر میری حالت کو دیکھ! کیا تو ہی نے ان ستم رانیوں کی اجازت دے رکھی ہے؟

کیا تو نے محکوم کو ذلت کا اور حاکموں کو عزت کا ٹھیکہ دار بنایا ہے۔؟ تیری حکومت میں یہ کیا اندھیر ہے آخر۔ انصاف کر انصاف!——"

——ایک اندھی بڑھیا لاٹھی ٹیکتی اُٹھ کھڑی ہوئی——

"ان داتا! میں بھی تو تیری رعایا ہوں اور میرا جوان بیٹا بھی۔ مگر تو ہم دونوں کو کیوں ستا رہا ہے۔؟ کیا تیری معدلت گستری کا یہی تقاضا ہے؟ تیرے مشیروں نے میرے لختِ جگر، میرے دل کے ٹکڑے، میرے بڑھاپے کے سہارے کو جو اپنے حق کی بھیک مانگ رہا تھا تمرّد اور سرکشی کے الزام میں بے گناہ قیدخانہ میں ڈال دیا ہے۔ میں اندھی اُس کے غم میں روتے روتے نیم جان ہو چکی ہوں۔ جب تو انصاف نہیں کر سکتا تو میں تجھے بادشاہ کیوں مانوں؟ لا یہ تاج میرے سر پر رکھ دے تاکہ میں ظالموں کو سزا دیکر اپنے زخمی دل کو تسلی دوں.... لا! ورنہ میرے ساتھ انصاف کر!——"

اب تو رعایا کا ہر طبقہ ٹوٹ پڑا! بیکس غلام بھی پرے باندھ کر آگے بڑھے ایک نے نمائندگی کر کے کہا۔

"کیا تو نہیں دیکھتا اے آقا! ہم کس بُری طرح قید و بند میں گرفتار ہیں —— ہم نے چوری نہیں کی چوری کرنے والے اور

ہوتے ہیں ـــــــ ہم نے ڈاکہ نہیں ڈالا۔ ڈاکہ ڈالنے والے اور ہوتے ہیں ـــــــ بس اس گناہ میں کہ ہمیں تو نے جنگ میں قیدی بنا لیا کیا ہم حق پرستی کے حق سے بھی محروم کر دیئے گئے۔ ہم کو غلام بنا کر ۱۹۴۵ء میں بھی مصائب سے گریز نہیں کرتا۔ ہم باغی ہیں مگر ہماری بغاوت گہری ہے یہ ہمارے جسم نہیں جو بغاوت کر رہے ہیں۔ یہ ہماری روحیں ہیں تو اُنہیں نہ غلام بنا سکتا نہ قید کر سکتا۔ اِن ظاہری جسموں کے ساتھ اگر رحم کر سکتا ہو تو کر ـــــــ انصاف درکار ہے ـــــــ

اندھوں، یتیموں اور بیواؤں کا جمِ غفیر جو بادشاہ پر ٹوٹ پڑا تھا کہنے لگا ـــــــ "تجھ سے پہلے بادشاہ ہماری کفالت کرتے رہے ـــــــ" ابھی جملہ پورا نہ ہو پایا تھا کہ ایک یتیم آگے بڑھا اور فریادی ہوا۔

"تو ہماری شکم پوری کا ذمہ دار ہے خزانہ تیرا نہیں ہمارا ہے۔ ہمارے لئے کھانا کپڑا اور ضروریات زندگی اس میں سے تجھے پوری کرنی ہوں گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تیرے عہد میں ہم نانِ شبینہ کو محتاج دربدر کی خاک چھانتے پھریں.... او شقی! تو نہ تو خود ہماری خبر گیری کرتا ہے نہ ہمیں گدائی کرنے

دیتا ہے۔ کیسا طرفہ ماجرا ہے کہ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار اُڑا اُڑا پھرے اور ہم یاس و افلاس کے عالم میں بھوکے مریں انصاف کر ظالم انصاف!

بادشاہ رعایا کی یہ فریاد و واویلا سن کر ششدر رہ گیا اسے خیال ہوا کہ کیا واقعی میری رعایا ایسی ہی دردمند اور دکھی ہے قصر شاہی میں پہنچکر اس نے دربار خاص منعقد کیا اور اپنے مشیر کاروں کو تمام ماجرا سنا دیا۔ جسے سن کر یہ درندہ صفت بندے کبر و نخوت سے سرشار بادشاہ کے سامنے ادب سے بیٹھ کر بولے ——

"اے ہمارے سرتاج! تجھے اس معاملے میں فکر و تردّد کی ضرورت نہیں۔ یہ تیرا شیوہ نہیں کہ ایسی لغویات اور فضولیات میں پڑ کر اپنی جان کو ہلکان اور اپنے عیش کو منغّض کرے بادشاہی کا منصب عیش و عشرت کے لئے ہے۔ خدا کا سایہ بادشاہ پر رہتا ہے۔ تو ظلّ اللہ ہے۔ اور رعایا کے سرکش انبوہ کی فکر تجھے زیب نہیں دیتی۔ ہم ابھی فریادیوں کی زبانیں بند کئے دیتے ہیں۔

دوسرے دن بادشاہ کی جانب سے ایک فرمان فریادیوں کے نام بایں مضمون جاری ہوا ——

"اے غریب مظلوم! مفلس اور دکھی رعایا! مابدولت کے دل میں تیرا بہت درد ہے مابدولت کی جان اور خزانہ تجھ پر قربان ہے تو رنج و مصیبت، غریبی اور افلاس کے صدمے نہ اٹھا۔ مابدولت نے اپنے مشیروں کو حکم دیدیا ہے۔"

ہفتے گذرے، مہینے ختم ہو گئے، سال پر سال گذرتے چلے گئے مگر مزدور اور اپاہج، غریب اور مظلوم، اندھی بڑھیا اور بیکس غلام، اندھی، بیوائیں اور یتیم سب کی وہی حالت رہی۔ بادشاہ کی رعایا کے غداروں کا منہ بند کر دیا لیکن اس کا پیٹ بھرنے کی ذمہ داری نہ لی ایسا کرتے تو وہ اپنا پیٹ کیسے بھرتے۔ بادشاہ کے گھوڑے کے علاج پر ہزار ہا روپیہ خرچ ہو گیا مگر اپاہج کا علاج نہ ہو سکا —— مزدور کی اجرت آٹھ آنے سے بھی کم ہو گئی لیکن دولت مند خون چوستا رہا۔ حاکم کے ظلم سراسر بنے رہے عیش کی اجارہ داری انھیں کا حصہ تھا۔ بڑھیا کا غریب بیٹا قید و بند کے مصائب میں گرفتار رہا۔ بیکس غلام بندگی کی قید سے نہ چھوٹے۔ باغی نے رہائی نہ پائی، یتیم اندھے اور بیوائیں اب بھی نانِ شبینہ کو محتاج ہیں اور —— بادشاہ دولت مند حکام اور سود خوار مہاجن سب پہلے کی طرح اب بھی اُسی عیش و عشرت میں مصروف ہیں اور رنگ رلیاں منا رہے ہیں ——

اُف! آدم کے بیٹے! حوّا کے سخت جگر! تو بڑی مصیبت میں ہے، "تکلیف میں ہے" بھوک پیاس کا مارا ہے تو ننگا بھی ہے، بھوکا بھی، کمزور بھی ہے غریب بھی لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ تو "غلام" ہے ——

بے چارے

جب میں نے حبیب کو ٹیلیفون پر یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ مجھ سے گھر کے علاوہ کسی اور جگہ ملنا چاہتا ہے تو میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میرے اس کے مراسم انتہائی مخلصانہ اور غرض سے پاک تھے' اور اُس کی بیوی ہر معاملہ میں میری رائے لینا ضروری خیال کرتی تھی۔

جہاں تک حبیب کی قابلیت کا سوال ہے واقعی وہ بہت ذہین تھا اور اُس کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ لیکن اس کی طبیعت میں خشکی' اور سنجیدگی کا عنصر بے حد غالب تھا' ایک خشک طبع مبصّر اور تفریحات کا مخالف ہونے کے باوجود وہ محبت کے معاملات میں بے حد دلچسپی لیتا تھا' اور ہر اس حسین عورت سے اس کا عشق ضروری تھا' جو اس سے ذرا اخلاق اور مروّت سے پیش آئے ——— غریب جمیلہ پھر بھی اُس کی مدّاح اور ثنا گو تھی' حالانکہ اس نے حبیب کے ساتھ پندرہ سال بڑی تلخیوں اور دلی کاوشوں کے ساتھ گذارے تھے۔

اسی دن شام کو حبیب میرے گھر چلا آیا'

"بھائی" اُس نے کسی قدر خوش مزاجی سے سگار سلگاتے ہوئے کہنا شروع کیا" براہِ کرم میرا ایک کام کر دو ——— تم جمیلہ کے مشیر کار ہو۔

اور جمیلہ کو اس وقت تمہاری ذات پر کامل بھروسہ اور مکمل اعتماد ہے ——— اور میرے خیال میں وہ صحیح راستہ پر ہے ——— یہ درست ہے کہ زندگی اور دنیاوی معاملات میں ہمارے نظریئے ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں، لیکن چونکہ وہ مدلّل ہیں اس لئے اگر جمیلہ جیسی نرم طبیعت اُسے اپنائے تو کوئی نقصان بھی نہیں ———

اس کے علاوہ تمہاری احتیاط اور صلح جوئی سے میں بڑی حد تک مطمئن ہوں، اور کبھی بھی نہیں سوچ سکتا کہ تم پر ایسے رازوں کا انکشاف ہو جائے جو دو میاں بیوی کے سلجھے ہوئے معاملات میں رخنہ اندازی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اور یہی اصل سبب ہے جو اس معاملہ میں مجھے تمہاری امداد کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی ہے"

اُس نے چرچل اسپیشل سگار کا ایک کش لگایا، اور معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھا، وہ نگاہیں جن میں التجا کے ساتھ ساتھ اپنے وقار کا بھی عکس نمایاں تھا۔

ہاں تو بات صرف اتنی ہے کہ قاہرہ سے میری واپسی ہوائی راستہ سے ہوئی، کیونکہ مجھے اُس لیکچر ٹور کے بعد ہی ہندوستان پہنچنا تھا ——— ہوائی جہاز میں ایک عورت ——— لیکن میں اُسے عورت کہہ کر زیادتی سے کام لے رہا ہوں ——— وہ ایک حسین اور جمیل لڑکی تھی، جس کی صہبا ریز آنکھیں محبت کے جام لنڈھا رہی تھیں ———

میری طبیعت محبت کے معاملے میں کمزور ہے، اس لئے میں اس سے بغیر مراسم بڑھائے نہ رہ سکا ——— اُس نے بھی کافی خلوص اور گرم جوشی کا ثبوت دیا.........

اس کے بعد کوئی خاص واقعہ تو ظہور پذیر نہ ہوا چونکہ حالات میرے سازگار نہ تھے، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس نے مجھے ہندوستان سے واپسی پر اپنے یہاں آنے کی ضرور دعوت دی ہے۔ اور یہ چیز میرے لئے بہت کچھ امید افزا ہے۔ اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ایسے معاملات میں، کہیں سے بھی ذرا سی امید ہو تو میں اپنے خیالات اُس جانب سے نہیں پھیر سکتا یہ میری فطرت ہے اور اس میں ایک قسم کی لذّت ہے ایسی لذت جو جوئے میں ہارنے اور جیتنے پر حاصل ہوتی ہے، اور اس قسم کی محبت کے نتائج پر اُسے دماغوں پر مستولی کر دیتے ہیں مگر تم جیسا ایماندار آدمی کبھی بھی اس کو تجربہ میں نہیں لا سکتا۔

اب کی بار پھر مجھے اُسی کمیٹی کی جانب سے قاہرہ آنے کی دعوت دی گئی ہے، جس نے گزشتہ سرما میں مجھے بلایا تھا، اور میں جانے کے لئے بالکل تیار ہوں، لیکن سوال صرف غریب جمیلہ کا ہے اور یہ کہ تم واقعی میرے۔

"میں ایسا کبھی بھی خیال نہیں کر سکتا۔" میں نے کہنا شروع کیا۔ "کہ میں تمہاری بیوی اور تمہارے درمیان کچھ.........."

"ذرا صبر کرو ——— میں تم سے کسی ایسے کام کے لئے نہیں

کہہ رہا ہوں جو جمیلہ کے لئے نقصان دہ یا تکلیف کا باعث ہو ——
لیکن دراصل معاملہ یہ ہے کہ وہ میرے قاہرہ جانے کی شدید مخالفت کر رہی ہے، اور اس شرط پر اجازت دے رہی ہے کہ میں اسے ساتھ لے جاؤں —— ...... اور یہ چیز یقیناً ناممکن ہے ——
اس طرح یا تو وہ میرے ذوقیات کے لئے ایک خلیج کی طرح حائل ہو جائیگی یا اُسے بعض تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا، جسے میں کسی صورت میں بھی مناسب نہیں سمجھتا —— کتنی نازک پوزیشن ہو گئی میری، آخر میں کیا کروں اور کس طرح اُسے اپنے ساتھ لے جانے سے روکدوں جو میرے اور اُس کے دونوں کے لئے بہتری کا باعث ہے ......

"اب ایک دوست کی حیثیت سے جو کچھ میں تم سے استدعا کرنا چاہتا ہوں وہ بہت صاف اور سادہ ہے۔ جمیلہ تم سے یقیناً اس بارے میں مشورہ لے گی، جیسا کہ اُس کا دستور ہے...... تم اُس سے صرف اتنا کہہ دو کہ اُس کا ساتھ جانا کسی صورت سے بھی ممکن نہیں ہے، چونکہ اس قسم کے سفر سے اوّل تو بہت کم آمدنی ہوتی ہے، دوسرے زیادہ وقت لنچ اور پارٹی کے علاوہ بڑے بڑے اداروں کے خوش آمدید کہنے میں صرف ہو جاتا ہے —— بہرنوع کسی نہ کسی طرح سے اُسے مایوس کر دو تاکہ وہ نہ تو میرے ساتھ جائے اور نہ مجھے جانے سے روکے۔ یہ سمجھ لو کہ میرا تنہا جانا بہت ہی مفید ثابت ہو گا جب میں واپس

آگر اُس سے ملوں گا .... غریب جمیلہ کا واقعی مجھے بے حد خیال ہے، لیکن یہ چیز تو ماننا ہی پڑے گی کہ ازدواجی تعلقات کتنے ہی خوشگوار ہوں، لیکن ان میں بھی جدائی ناخوشگواری کا کام دیتی ہے۔"

وہ اسی موضوع پر تقریباً ایک گھنٹہ تک اپنی فلسفیانہ اور مبصرانہ تقریر کے پیچ و خم کو وسیع کرتا چلا گیا اور آخر کار بغیر مجھ سے وعدہ لئے چلا گیا۔

سوئے اتفاق سے اس کے بعد ہی جمیلہ نے مجھے فون کیا، اور فوراً گھر آنے کو کہا، اور ساتھ ہی چائے کی دعوت دیتے ہوئے کسی مسئلہ پر رائے لینے کو بھی کہا ——

میں نے اُسے پیانو پر گاتے ہوئے پایا، سہ پہر کی ٹھنڈی کرنوں کا انعکاس آج اُسے جوان بنائے ہوئے تھا، حالانکہ اس کی عمر چالیس سے بھی متجاوز ہو گی لیکن وہ عنابی ساری اور چمکیلے طلائی نیکلس میں تیس سے بھی کم معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے میرا حسبِ معمول گرم جوشی سے استقبال کیا، اور ایک انتہائی سامع پرور گیت سنا کر، چائے کے لئے گھنٹی دی تاکہ کوئی ہماری باتوں میں مداخلت کا باعث نہ بن سکے۔

"بھائی التفات" اُس نے خوش گلوئی کے ساتھ کہنا شروع کیا، براہ کرم میرا ایک کام کر دو، مگر وعدہ کرو کہ اس معاملہ کو بالکل راز رکھو گے، کیونکہ اس میں ....!"

"جمیلہ تم جانتی ہو.........!" میں نے کہا ہی تھا کہ اُس نے بات کاٹ کر پھر سلسلہ گفتگو شروع کر دیا۔

"تم دنیا میں پہلے اور آخری شخص ہو التفات جس پر مجھے مکمّل بھروسہ اور پورا پورا اعتماد ہے۔ لیکن یہ معاملہ بہت سنجیدہ ہے، جس میں مجھے تمہارے مکمّل تعاون کی شدید ضرورت ہے، بات یہ ہے کہ مجھے ایک شخص سے انتہائی اُنس ہے، وہ لکھنؤ یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا ہے اور کشمیر کے کسی غریب خاندان کا جوانمرد ہے ——— وہ انسان ہے لیکن اُس کا حسن فرشتوں کی طرح نکھرا ہوا، اور دیوتاؤں کی طرح پاک اور صاف ہے۔ وہ انتہائی متین اور مہذّب اسٹوڈنٹ ہے جو زیادہ تر اپنا وقت تنہائی اور کتابوں میں گزارتا ہے، ——— حالانکہ وہ کسی حد تک مخبوط الحواس کہا جا سکتا ہے، لیکن مجھے خوش رکھنے کے لئے وہ کوئی وقیقہ باقی نہیں رکھتا......... اُس کے خلوص اور اس نے مجھے مسرور اور مطمئن کر دیا ہے ———!"

"اور حبیب! ———" میں نے کہا۔

"حبیب کو اُس کے متعلق کچھ علم نہیں ہے ——— حبیب اپنی رحم آلود نگاہیں غریب جمیلہ پر ضرور ڈالتے رہتے ہیں جو شاد و ناشاد اُن کی لاپرواہیوں اور فریبِ محبت کو گوارہ کر لیتی ہے تاہم اپنے آپ کو اُن کے بندھن سے نہیں چھڑا سکتی......... التفات میرا یقین ہے کہ حبیب کو مجھ سے زیادہ ایک یہودی لڑکی سے محبت ہے.......!"

"کیا ـــــــ کیا تم کو بھی اُس کے متعلق کچھ علم ہے"۔ میں نے پوچھا

"ہاں مجھے عرصۂ دراز سے معلوم ہے"۔ اُس نے کہا "لیکن تمہیں کس طرح اس کے متعلق علم ہوا؟"

"جیب نے مجھے اس کی بابت کچھ باتیں بتائی تھیں"۔ میں نے جواب دیا ـــــــ

"اور تم اب تک اس معاملہ کو چھپائے ہوئے ہو" آخر تم کیسے دوست ہو التفات ـــــــ لیکن مجھے یہ معلوم کر کے واقعی مسرت ہوئی کہ تم میرے معاملات میں اِس قدر دلچسپی رکھتے ہو کہ ایسی معلومات بھی تمہیں رہتی ہیں۔ بہر کیف کیونکہ تمہیں اُس لڑکی کے متعلق علم ہے اس لئے اب میں ذرا آسانی کے ساتھ تم سے کچھ کہہ سکوں گی ـــــــ التفات اگر ایسا ہو جائے کہ جیب مجھے اِس پندرہ روزہ سفر میں تنہا چھوڑ دیں تو میں یقیناً اُس سے مل سکوں گی ـــــــ"

"سنو جمیلہ، جیب اس سفر میں تنہا جانے کے لئے بے حد متفکر ہے۔ لیکن وہ محسوس کرتا ہے ......!"

"ایک منٹ جیب ـــــــ میں جانتی ہوں کہ وہ واقعی جانے کے لئے بے چین ہے، لیکن جب جیب نے مجھ سے جانے کے لئے کہا تو میں نے اُس کی جدائی پر سخت احتجاج کیا اور کچھ دیر تک آنسو بہاتی رہی جس سے اس کے ارادے کچھ متزلزل سے ہو گئے ـــــــ"

"میری سمجھ میں نہیں آتا جمیلہ کہ یہ ڈرامہ کیوں کھیلا جا رہا ہے ـــــ"

"اس لئے کہ مسکراہٹ اور خوشی کے ساتھ اُسے جانے کی اجازت دینا، اُس کے دل میں شبہات کا پیدا کرنا تھا۔ جو کچھ میں چاہتی ہوں التفات! مختصراً یہ ہے کہ تم اسے سمجھاؤ کہ اس کا یہ سفر کیونکر اقتصادی مشکلات میں کمی کا باعث ہوگا۔ اس کی شہرت اور عزت میں اضافہ کا باعث ہوگا اس لئے اُسے جانا ہی چاہئے۔ اور اس بات کا بھی تذکرہ کردینا کہ وہ اپنے اس احساسِ ہمدردی کو ختم کردے جو میری جانب سے اُس کے دل میں ہے ورنہ وہ اپنے گھر کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا، اور یہ بھی کہدینا کہ جمیلہ کو اُس کی جدائی کا یقیناً رنج ہوگا اس لئے خط وغیرہ میں کسی قسم کی تاخیر نہ کرے ——— اور تم تو خود بھی سب معاملات کو سمجھتے ہو التفات ———"

"بیچارہ حبیب" ——— میں نے کہا

"ہاں" اُس نے بھی کہا ——— "بیچارہ حبیب"

"بے چاری جمیلہ" میرے دل نے آواز دی۔

حقیقت یا افسانہ

چوبیس سالہ لیسین ایک خوبصورت، جوان اور شادی شدہ طالبِ علم تھا۔ اور دوسرے کالج کے ذہین طلبا کی طرح وہ بھی کافی محنتی اور پڑھنے والا لڑکا تھا، لیکن اس کے متعلق ایک عجیب اور پُر اسرار گتھی یہ تھی کہ وہ ہمیشہ اپنی بیوی کا ذکر کیا کرتا تھا ———— ہوسٹل کے رہنے والے تمام لڑکوں نے کبھی بھی اس کی میز کو ایک خوبصورت اور حسین فریم میں انتہائی نفاست سے رکھی ایک تصویر سے خالی نہ دیکھا ———— یہ اس کی بیوی کی تصویر تھی جس کی عمر تقریباً پچیس سال ہوگی۔ وہ ہمیشہ اپنی بیوی کے مافوق الفطرت کاموں کے تذکرہ کیا کرتا تھا، جس کا زیادہ حصہ ہم لوگوں کے یقین سے باہر تھا۔ مثال کے طور پر ہم سب کو اس امر کا بالکل یقین تھا کہ وہ کشیدہ کاری کا بہترین کام جانتی ہے، کھانا پکانے کے معاملہ میں وہ بہت ہوشیار ہے مگر یہ چیزیں اس لئے قابلِ اعتنا نہ تھیں کہ ہر اوسط عمر کی لڑکی ایسے خانہ داری کے کاموں سے تھوڑا بہت ضرور واقف ہوتی ہے۔

ایک بار صبح جب ہم اُس کے کمرے میں خلافِ معمول گئے تو وہ ہم سے بہت کھل کر ملا اور تقریباً دو تین گھنٹے محض اپنی بیوی کے گن گانے میں صرف کر دیئے۔ اُسی روز دورانِ گفتگو میں اُس نے ایک بڑی حیرت انگیز

بات بتائی جسے ہم میں سے کسی نے بھی حقیقت نہ سمجھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیوی ایک زبردست علمِ نجوم کی ماہر ہے اور اس کی روحانی قوتیں ہمیشہ بیدار رہتی ہیں۔ اسی علم اور روحانی قوت کے زور سے وہ روزانہ رات کو لیٰسین سے ملنے آتی ہے اور کچھ دیر کی گفتگو کے بعد واپس ہو جاتی ہے۔

اس بات کو ماننے کے لئے ہم لوگوں میں سے کوئی بھی تیار نہ تھا لیکن چونکہ لیٰسین ایک حساس اور مذہبی قسم کا لڑکا تھا اس لئے ہم نے کبھی بھی اپنے شبہات اور شک پرستی کا اظہار اُس کے سامنے نہیں کیا ———

اس واقعہ کو ہم سے بیان کر دینے کے بعد جب بھی وہ ہم سے صبح کے وقت ملا اُس نے اپنی بیوی اور رات کی ملاقات کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور کہا۔ لیکن ایک روز ایک غیر معمولی واقعہ نے ہم سب کو اس پُراسرار راز کے متعلق کچھ نہ کچھ معلوم کرنے پر مجبور کر ہی دیا:۔

واقعہ یہ تھا کہ ایک روز صبح لیٰسین اپنے کمرہ سے خلافِ عادت مایوس نظر، اور اُداس اُداس سا باہر آیا ——— ہم لوگوں نے ایک ہی نظر میں یہ اندازہ کر لیا کہ آج رات اُس کی بیوی سے ملاقات نہ ہو سکی ——— کچھ تو تفریح اور کچھ ہمدردی کی طور پر ہم نے اُس سے اِس غیر معمولی اضمحلال کی وجہ دریافت کی۔ اُس نے بتایا کہ آج رات اُس کی بیوی نے بتایا ہی کہ اس کے والد کی طبیعت بے حد ناساز ہے ——— ہم نے پھر سب کچھ حسبِ دستور سن تو لیا لیکن، لیٰسین کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ ......

لیکن جب دس بجے ایک تار آیا جسے ہم نے انتہائی احتیاط سے لیٰسین سے

قبل ہی پڑھ لیا تب تو ایک قسم کی سراسیمگی ہم سب میں سرایت کر گئی۔ تار اُس کے گھر سے آیا تھا، جس میں اُس کے والد کی طبیعت کی ناسازی کی اطلاع تھی۔ اور وہی بیماری جو علی الصبح اُس نے ہمیں بتائی تھی۔

دوسری صبح لیسین ہم لوگوں سے ملا۔ اُن تمام لڑکوں سے جنہوں نے راستہ ہی میں اس کا تار ڈاکیہ سے لے کر پڑھ لیا تھا۔ اور اُس نے ہم سب کے نام بتائے کہ اِن اِن لڑکوں نے میرا تار پڑھا، معلوم ہوتا تھا کہ وہ اِس بات پر زیادہ کڑھ گیا تھا۔ بہرکیف اس تار پڑھنے کے واقعہ سے ہم پر کوئی اثر نہ ہوا، کیونکہ ہم نے خیال کیا کہ تار پڑھنے والوں میں سے کسی ایک نے لیسین کو ہم سب کے نام بتا دیئے ہوں گے..... بہرنوع کچھ روز میں اس کے والد کی طبیعت ٹھیک ہو گئی اور یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا ——————

جوں جوں ہمیں لیسین اور اُس کی پراسرار بیوی کے متعلق تشویش ہوتی جا رہی تھی، یونی ورسٹی کا امتحان اتنی ہی تیزی کے ساتھ قریب آتا جا رہا تھا فائنل ایر کا امتحان اور ہم سب کے سب ایک پرچے علم الادویہ میں بے حد کمزور۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کئی ایک مشکلیں ہم پر بہ یک وقت آپڑیں تھیں۔ بالآخر ہم لوگوں نے ان سب چیزوں کا صرف ایک حل تلاش کر لیا وہ یہ کہ لیسین کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی بیوی سے اس پرچے کے تمام سوالات معلوم کرے —— استدلال یہ تھا کہ جس کی روحانی قوتیں ہمیشہ بیدار

رہتی ہیں اُس کی نظروں سے دنیا کا کوئی کام پوشیدہ نہ رہا ہے اور نہ رہ سکتا ہے اِس طرح لیسین اور اس کی سچائی۔ اُس کی بیوی اور اس کی روحانی قوت اور ہمارے کمزور مضمون میں قابلِ قدر امداد۔ سب کچھ سامنے آسکتا تھا ——————

ایک روز بڑی ترکیبوں سے ہم نے لیسین کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ متذکرہ پرچہ سے پہلے رات کو وہ کسی نہ کسی طرح اپنی بیوی سے اُن سوالات کو معلوم کرے۔ اس کا وعدہ گو ہمارے لئے قابلِ اطمینان نہ تھا کیونکہ ہمیں اُس پر شروع ہی سے یقین نہ تھا لیکن پھر بھی ہم لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ ایک سکون سا طبیعت کو مل گیا ہے اور امتحان کے قریب آنے سے جو بے چینیاں ہم میں پیدا ہوتی جا رہی تھیں وہ بھی بتدریج ختم ہونے لگیں ——————

انتظار کی لاکھوں گھڑیاں بے چینی اور بے اطمینانی سے گزر گئیں اور آخر کار وہ اہم اور خاص رات آئی اور چلی گئی —————— صبح جب لیسین اپنے کمرہ سے باہر نکلا، تو ہم لوگوں کو اُس نے منتظر پایا۔

"اس نے مجھے پرچہ کے تمام سوالات بتا دیئے"! لیکن بڑی کرب انگیز آواز میں اُس نے ہم سے کہا۔ اور ساتھ ہی اُس نے یہ بھی بتا دیا کہ اب وہ کبھی بھی مجھ سے اس کمرے میں ملاقات نہیں کرے گی ——————"!

سوالات کسی تھیٹر یا سینما کے پروگرام کی پشت پر لکھے ہوئے تھے

سب کے سب نہایت معقول، اہم اور سخت تھے، جن کے متعلق ہر شخص کو گمان ہو سکتا تھا کہ وہ پوچھے جا سکتے ہیں۔ گیارہ سوالات کو نوٹ کرنا، اور پھر ان کا حل کئی ایک حوالے کی کتابوں سے تیار کرنا، بہت دیر کا کام تھا، مگر ہم لوگ بھی جو پرچہ میں شریک ہونے والے تھے گیارہ کی تعداد میں تھے۔ اس لئے یہ کام انتہائی استعداد اور قابلیت سے کام لینے کے بعد صرف ایک گھنٹہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

کچھ دیر بعد جب امتحان ہال میں ہمیں پرچہ تقسیم کیا گیا تو میں بدحواسی کے باعث پسینہ میں شرابور ہو گیا اور میرے تعجب اور حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب کہ میں نے سوالات کی زبان تک میں کسی قسم کا ردّوبدل نہ پایا ہو بہو وہی سوالات، جو لیسین نے ہمیں صحیح بتائے تھے اور اُسی تعداد میں۔ بہر حال کیونکہ سوالات امتحان سے قبل ہی حل کر لئے گئے تھے اس لئے ہم سب لوگ اپنے پرچے بہت اطمینان اور سکون سے کرنے کے بعد وقت ختم ہونے سے آدھ گھنٹہ قبل ہی اُٹھ گئے۔

کسی نہ کسی طرح یہ معاملہ کالج کے ذمہ دار پروفیسروں کے نوٹس میں آ گیا۔ یہ لوگ سب کے سب تقریباً یورپین تھے۔ یورپین ایسے معاملات کو بالکل واہمہ سمجھتے ہیں پھر بھی ہماری کاپیاں کئی بار جانچی گئیں، ہم سب کے لکھنے کا طریقہ کا ایک، سب نے اُن ہی نکات کی وضاحت اور تشریح کی تھی جو ہم میں سے کسی ایک نے کی ہو۔ آخر کار کرنل نے جو

ہمارے کالج کا پرنسپل تھا معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا لیسین کو بلا کر اُس نے واقعات کی اصلیت کو تولنا چاہا، مگر لیسین نے انتہائی چالاکی اور قابلیت کے ساتھ کرنل کو کچھ ایسے مبہم اور احمقانہ جوابات دیئے کہ معاملہ کی نزاکت ایک لخت ختم ہو گئی۔

وہ اوّل تو ایسی چیزوں پر کبھی بھی یقین نہ کر سکتا تھا، پھر لیسین کے جوابات نے اُسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ یہ سب کچھ حماقت ہے اُس نے اپنی تحقیقات کا جو نتیجہ نکالا وہ کم و بیش یہی تھا کہ تمام طالب علم امتحان مضمون میں بے حد قابل اور ہوشیار ہیں۔ اسی لئے انہوں نے پرچہ کو بہت اچھی طرح حل کیا، دراصل پرنسپل ہی اس مضمون پر ہم کو لیکچر دیا کرتا تھا، اِسی وجہ سے اُسے ہم پر فخر بھی تھا۔ ہم سب کی اس نمایاں کامیابی پر ہر چہار طرف سے مبارکباد کی بوچھاڑیں شروع ہو گئیں۔ لیکن اس کامیابی کی سچی وجہ تو لیسین کی بیوی تھی —— اس لئے ہم سب نے یہ طے کیا کہ اُسے ایک سنہری نیکلس پیش کیا جائے اور اِس طرح اپنی عقیدت مندی اور ارادت کا اظہار کیا جائے۔

اب ہم سب مکمل ڈاکٹر تھے، لیکن ایک عجیب چیز جو سننے میں آئی وہ یہ تھی کہ لیسین کی بیوی اپنی عرفانی قوتوں سے پرچہ بتانے والی رات کے فوراً بعد ہی بیمار ہو گئی ہے۔ کچھ روز بعد جب ہمیں اس کی طبیعت ٹھیک

ہونے کا علم ہوا تو وہ سنہری نیکلس اُس کو ارسال کر دیا گیا۔
کسی امتحان کا کوئی پرچہ اس طرح معلوم کر لینا کہ اُس میں لفظی غلطی تک نہ ہو' اور ہر شب ایک دور دراز مقام سے آ کر گفتگو کرنا' غیب کی خبریں دینا۔ یہ سب کچھ ایک معمّہ تھا۔ بہر کیف لیسین اور اس کی بیگم کی طرف سے ہمارے دلوں میں ایک جذبۂ عقیدت کے ساتھ اس معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کا خیال بھی پیدا ہو گیا —— چنانچہ لیسین سے جو اَب ڈاکٹر لیسین تھا اصرار کیا کہ وہ ہماری بے چینیوں میں کسی طرح کمی کر دے بڑی مشکلوں کے بعد جو کچھ لیسین نے ہمیں بتایا وہ یہ تھا:۔

"میری بیوی ایک عابد اور شب زندہ دار عورت ہے۔ حالانکہ وہ عمر میں مجھ سے بڑی ہے لیکن مجھے اس سے کافی محبت تھی اور میں نے اُسے اپنی رفیقۂ حیات بنانے میں کوئی تعرّض نہ کیا۔ اُسے بھی مجھ سے اتنی ہی محبت اور خلوص ہے جتنا کہ میرے خیالات سے تم لوگ پتہ چلا سکتے ہو ——

ایک مرتبہ اُس نے مجھے ایک طلائی زنجیر مع کیس کے دی جس میں ایک عجیب قسم کا طلسم آویزاں تھا۔ بیگم نے مجھے بتایا کہ جب بھی میں اس کو پہن لوں گا وہ ضرور میرے پاس آ جائے گی۔ چنانچہ میں دورانِ تعلیم میں (جب سے میں نے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا ہے) برابر اُس سے ملتا رہا ہوں۔ اُس رات بھی میں نے وہی عمل کیا اور وہ میرے پاس آ گئی۔ اُس کے آنے سے مجھ پر ایک روحانی عالم

اور مراقبہ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور میں اپنی جگہ سے ہل جل نہیں سکتا ہوں۔ اِس لئے میں یہ صحیح صحیح نہیں بتا سکتا کہ وہ جسمانی طور پر مجھ سے ملاقات کرتی ہے یا روحانی ——— اور خیالی طور پر بہر نوع ملاقات ضرور ہوتی ہے۔ جب میں نے اُس سے پرچہ کے متعلق دریافت کیا تو اس نے سختی سے مجھے منع کر دیا لیکن اُس کے انکار سے میرا اصرار پیہم بڑھتا گیا، چونکہ مجھے تم لوگوں کے شبہات کو مٹا کر اپنی بیان شدہ حقیقتوں کے لئے ایک جگہ پیدا کرنی تھی ——— اس لئے پرچہ کے سوالات بولنے شروع کر دیئے۔ قریب ہی میرے پاس سینما کا اشتہار رکھا ہوا تھا وہ میں نے اٹھا لیا اور اُس پر لکھتا گیا تاکہ بھول نہ جاؤں۔ جب میں آخری سوال کا آخری حرف لکھ چکا تو اُس نے مجھے بتایا کہ اب وہ کبھی اس مقام (ہوسٹل) پر مجھ سے ملاقات نہ کرے گی۔ یہ کہتے ہوئے وہ میری طرف آگے بڑھی، میرے قمیص کے بٹن کھولے اور اُس طلائی زنجیر کے طلسمی تعویذ کو نکال لیا۔ اُس کے بعد مجھے ہوش آگیا اور وہ غائب ہو گئی۔ وہ طلائی زنجیر ابھی تک لیسین کے گلے میں پڑی ہوئی تھی اور ایک جگہ سے شکستہ تھی جس کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اس کا کوئی خاص حصہ نوچ لیا گیا ہے۔

امتحان کے فوراً بعد ہی میں سلطان پور گیا تاکہ اس کی ناراضی کو مٹانے کی کوشش کروں۔ لیکن جب میں نے امتحان کے پرچہ والی

رات کا ذکر چھیڑا تو اُس کے چہرہ پر سختی کے آثار نمودار ہوئے اور آنکھیں چمکنے لگیں۔ میں سہم گیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر میں نے وہی ذکر چھیڑ دیا جس پر اس نے مجھے سختی سے منع کر دیا کہ زندگی بھر اب اس معاملہ پر نہ کچھ کہا جائے اور نہ سنا جائے ——————"

اور یہ پُراسرار معمہ حل نہ ہو سکا۔"

نذرِ دریا

نواحِ دہلی میں دریائے جمنا کے کنارے کنارے وکٹوریہ جارہی ہے اس کے پہیوں سے گرد کے بغارے نکل رہے ہیں اس میں پانچ چھ عورتیں ہیں۔ ایک چھوٹا لڑکا ہے۔ اور ایک سن رسیدہ شخص ڈرائیور کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ دہلی کی سیر کرانے والا رہبر وکٹوریہ کی چھت پر بیٹھا ہے بوڑھا کبھی کبھی اس کا جواب دیدیتا ہے۔ مگر زیادہ تر خاموش رہتا ہے۔ اُس کی صورت سے مایوسی ٹپک رہی ہے۔ مگر گاڑی کے اندر عورتیں ایک منٹ کو خاموش نہیں رہتیں۔

"کہو پسند ہے"

"ہاں پسند تو ہے۔ لیکن اس سامنے والے کھیت پر ٹہلنا اس سے بھی بہتر تھا!

"تیری بھی کیا باتیں ہیں چلی ہے کھیت کی سیر کرنے۔ تیرے دل میں بھی نرالی امنگیں پیدا ہوا کرتی ہیں"

"لڑکی ہنسی اور کہنے لگی"

"جی لوگوں کے کاروبار چاہے سمجھداری کے ہوں لیکن امنگیں نرالی ہی ہونی چاہئیں"

سچ کہئے کہ کیا آپ کے دل میں نہیں آتا کہ اس خاک اڑاتی ہوئی

گاڑی سے اتر کر چلیں"۔

"بیٹی ہم لوگ بڈھے ہوئے۔ اب ہمیں دوڑنے پھرنے کی امنگیں کہاں۔ ہے ہے کیسی گرمی ہے دیکھیں ہم لوگ کیسے پہونچیں ابھی دس بھی نہیں بجا اور ہوا منہ پھونکے دیتی ہے۔ واپس ہوتے وقت نہ جانے کیا حال ہو" اتنے میں چھوٹا لڑکا بولا۔

آئیے چچی ذرا دیکھئے کیا اچھا باغ ہے۔ اور کتنا اچھا مینار ہے۔ لیکن یہاں کوئی مکان کیوں نہیں ہے"۔

سارہ چپ رہو۔ تم بھائی بہن دونوں ایک ہو نہ آپ چپ رہتی ہے نہ تم چپ رہتی ہو۔ ریحانہ ہنسی اور کہنے لگی کہ اسی لئے تو میں کہتی تھی کہ سب کا ساتھ چلنا ٹھیک نہیں ہے۔

بوڑھی عورت نے منہ بنا کر کہا" ہاں روپیہ کو پانی کی طرح بہاؤ۔ بھلا دو دفعہ گاڑی کا کرایہ دینے سے کیا فائدہ ہوتا ہے"۔

گاڑی چلی جا رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف مکانات نہ تھے جہاں کہیں سڑک کے کنارے جھاڑیاں یا درختوں کی قطاریں نہ تھیں وہاں دور کی عمارتیں نظر آجاتی تھیں۔ سڑک کے ایک طرف ہرے ہرے کھیت تھے۔ کہیں کہیں گھاس اور جھاڑیاں تھیں اور کہیں زمین خالی تھی سرخی کٹی ہوئی دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں باغ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دوسری طرف جمنا کی نیلی دھارا بہہ رہی تھی اور اس کے

کنارے کنارے جہاں تک نگاہ جاتی تھی ہرے بھرے کھیت نظر آتے تھے۔ یکایک لڑکا بولا آپا دیکھو کیا مزے کا سین ہے۔ پانی کے اندر ایک ٹوٹا ہوا مکان دکھائی دیتا ہے۔ آخر اس میں رہتا کون ہے؟" اس میں تیرا سسر رہتا ہے" یہ کہہ کر بڑی بہن ہنس دی۔ اتنے میں گاڑی کی منزلِ مقصود آ گئی۔

بوڑھا بڑی مشکل سے گاڑی پر سے اترا۔ نوجوان گائڈ جھٹ پٹ نیچے کودا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر بولا آئیے اماں ہم لوگ اپنی جگہ پر پہنچ گئے یہیں لال قلعہ کی آخری حد ہے۔ گاڑی کے اندر سے ایک ایک کر کے سواریاں اتریں۔ لیکن لڑکا پہلے اترنے کے شوق میں کود پڑا۔ اس کا پاؤں اس کی شلوار میں پھنس گیا اور وہ دھم سے سڑک پہ گرا۔ اس کے رونے چیخنے کی آواز اس کی چچی کی ناراضگی کی صدا اور نوجوان گائڈ کی پچکار ہوا میں گونجنے لگی۔ بڈھے نے کسی طرح ان کو خاموش کیا اور کہا کہ جلدی کرو ورنہ گرمی زیادہ ہو جائیگی۔

جہاں یہ لوگ گاڑی سے اترے وہاں سے ایک پگڈنڈی گھاٹ تک جاتی تھی۔ آگے آگے گائڈ چلا اور یہ سب چھوٹے بڑے پیچھے ہو لئے۔ ریحانہ نے اپنے چھوٹے بھائی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ اب کہیں نہ گرنا میرے ہاتھ کو پکڑے سیدھے چلے چلو۔ اب کے اگر تم نے میرا ہاتھ چھوڑا تو پانی میں ڈبکیاں کھانے لگو گے۔

بھائی ایک دفعہ گر کر سبق سیکھ گیا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنی بہن

کا ہاتھ پکڑے چلتا رہا۔ ان کی چچی ایک ہاتھ میں وہ صراحی لئے ہوئے تھیں جس میں پانی تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی ساڑھی کا کونہ پکڑے ہوئے تھیں، وہ بہت آہستہ آہستہ ڈھال کے راستہ پر چل رہی تھی۔ ریحانہ بہت آگے جا چکی تھی۔ اس کی چچی ناراض ہو کر چیخی۔

"ارے میں پوچھتی ہوں تو دوڑتی کیوں چلتی ہے۔ سنسان جگہ پر آگئے لیکن ان لوگوں کی وحشت نہیں گئی۔ اور اس لڑکی کو تو کچھ ہوش بھی نہیں ہے کہ اس کے سر پر کیا مصیبت آنے والی ہے۔"

اس بوڑھی عورت کے ساتھ تین اور بیوائیں تھیں ریشمین ساڑیاں پہنے ہوئیں تھیں۔ انہوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ لیکن ان کا زیادہ تر خیال اس ڈھالو زمین کی طرف تھا جس پر آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی وہ اتر رہی تھیں۔ پانی کی آواز سن کر ریحانہ کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہونے لگے۔ بھائی نے کہا یہ جگہ بہت خوبصورت ہے۔ کل ہم لوگ جب یہاں آئیں گے تو چچی کو ساتھ نہ لائیں گے یہ بہت بکتی ہیں" گائڈ بھی ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ سامنے ہی ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ اور ایک بڑا اشوتھ برگسن تھا۔ گائڈ نے کہا یہ منو کامنا کا مندر ہے۔ یہ بڑے پر سدھ دیوتا کا استھان ہے، یہاں جو بردان مانگو ضرور ملتا ہے۔

ریحانہ اشوتھ کے سایہ میں کھڑی تھی۔ دھوپ اتنی تیز پڑ رہی تھی کہ راہ چلنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ لیکن جب اور ساتھی آگئے تو اُسے بھی ان کے

ساتھ ساتھ چلنا پڑا۔ اب یہ لوگ بالکل گھاٹ کے کنارے پہنچ گئے بہت دور تک انہیں کیچڑ میں چلنا تھا۔ چھوٹے بھائی نے کہا کہ میں اپنے جوتے اتارنا چاہتا ہوں لیکن انہیں رکھوں کہاں۔

اس کی بہن نے کہا "وہیں گاڑی میں کیوں نہ اتار دیئے تھے بندر کہیں کا۔"

"یہ سن کر بوڑھی چچی بولی واہ اور جو گاڑی میں سے جوتے چوری ہو جاتے سارہ تو بھی بھولی معلوم ہوتی ہے کون جانتا ہے گاڑیبان کیسا آدمی ہے کوئی چیز کیوں اُس کے سپرد کی جائے۔"

لیکن واقعہ یہ تھا کہ گاڑی والے کو ابھی تک کرایہ نہیں ملا تھا اگر وہ محض پھٹے پرانے جوتے لیکر چلا جاتا اور کرایہ چھوڑ جاتا تو اس میں اس کا نقصان ہی تھا۔ یہ بات ریحانہ کے خیال میں آئی۔ لیکن اس نے سوچا کہ چچی کو کون سمجھائے۔ یہ سمجھنے کی تو ہیں نہیں۔ بوڑھوں سے بحث کرنا فضول ہے۔ اس لیئے اس نے بھائی سے کہا تم جوتے اتار لو میں ہاتھ میں لے چلوں گی۔ اس عرصہ میں بوڑھا کشتی کے ملاح سے کرایہ طے کر رہا تھا طے ہو جانے کے بعد ایک ایک کر کے یہ لوگ کشتی میں سوار ہوئے ملاح نے انہیں چند ہدایتیں کیں۔

جب کشتی بیچ دھار میں پہونچی تو گرمی کی شدت کم ہونے لگی کشتی کے سوار ذرا آرام کرنے لگے۔ ریحانہ کا گھونگھٹ اس کے سر سے اتر گیا

اس کی آنکھوں کا عجب عالم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دریا کی گہرائی کا عکس ان میں پڑ رہا ہے۔ پانی سے جو قدرتی موسیقی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ دل پر عجیب سرور کا عالم طاری کرتی تھی۔ ریحانہ کے دل میں ان شکلوں کا تصور آنے لگا جن کو وہ قریب قریب بھول چکی تھی۔ بہت سی کشتیاں آئیں اور پاس سے نکل گئیں۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے یاتری آئے ہوئے تھے۔ بعض تو اپنے دھارمک برت کو پورا کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ اور بعض محض سیر و تفریح کے لئے آئے تھے۔ یو۔پی کی عورتیں رنگین پوشاکیں پہنے ہوئے تھیں۔ مدراس کی دیویاں کالی ساڑیاں پہنے ہوئے تھیں۔ مسلمان عورتوں کی پوشاک میں سنہری جھالریں لگی ہوئی تھیں۔ بعض کشتیوں پر۔۔۔ جھگڑا ہونے کی وجہ سے خفا تھیں۔ بعض میں عشقیہ گانے گائے جا رہے تھے۔ بعض میں سے مہلاؤں بچوں کی میٹھی میٹھی آوازیں آ رہی تھیں۔ کچھ کشتیاں دریا کے ساحل پر بندھی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ جن پر بنگالی عورتیں سوار تھیں۔ اور بڑے شوق سے یاتریوں کے ہجوم کو دیکھ رہی تھیں۔

دریا کی دوسری طرف کھیت ہی کھیت نظر آ رہے تھے۔ ہرے ہرے اناج کے پودوں کے درمیان کسانوں کے جھونپڑے نظر آتے تھے۔ کھیتوں میں بیچ بیچ سے پگڈنڈی کے نشانات دکھائی دیتے تھے۔ بہت دور پر چھوٹے سے ٹوٹے پھوٹے مندروں پر نگاہ جاتی تھی اور درختوں کے سایہ میں ایک گاؤں کے نشانات بھی پائے جاتے تھے۔ سبزے کے

بیچ میں یہ گاؤں کا نظّارہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی ماں بچے کو اپنی گود میں لئے ہوئے ہے۔

چھوٹے بھائی نے پوچھا کہ یہ جو بڑا سا سرخ مکان دکھائی دیتا ہے یہ کس کا ہے۔ کیا یہ انگریزوں کا ہے۔ دیکھو وہ برآمدہ میں بیٹھا ہوا ایک صاحب نظر آتا ہے۔

قبل اس کے کہ ریحانہ کچھ جواب دے رہبر نے کچھ کہنا شروع کیا چھوٹا بھائی اس کی طرف منہ کھولے ہوئے تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں بوڑھے نے بات کاٹ کر کہا۔ یہ شہنشاہ اکبر کا پرانا قلعہ ہے۔ تم نے تاریخ میں اس کا حال پڑھا ہوگا۔ اب اس میں انگریزی سپاہی رہتے ہیں۔ یہ عظیم الشّان قلعہ تین صدی پرانا ہے۔ لیکن اب بھی اس کی شوکت قائم ہے۔ زمانہ کے اثرات کو جسمانی طور پر اس نے قبول نہیں کیا ہے اب تک اس کا چمکدار سرخ رنگ قائم ہے۔ دریائے جمنا میں اس کا عکس پڑنے سے تو آب عمارت نظر آ رہی تھی لیکن اب اس کے جھروکوں میں قدیم شہنشاہوں کے حرم کی عورتیں نہ تھیں ان کے زیورات کی آواز پانی کے قدرتی راگ کے ساز کا کام نہ دیتی تھی۔ گورے بدلیشی پوشاک میں چھجّوں پر بیٹھے ہوئے دریا کے کنارے کی سیر و ہوا کا لطف لے رہے تھے بعض مچھلی کا شکار کھیل رہے تھے ان کی وحشیانہ نظروں سے پانی بھری عورتیں ڈری جا رہی تھیں۔

کشتی چلتے چلتے قلعہ کے قریب پہنچ گئی۔ رہبر اس قلعہ کی شان و شوکت کا ذکر کر رہا تھا۔ بوڑھی چچی نے اپنے منہ پر گھونگٹ کر لیا اور کہنے لگی "خدایا جہاں دیکھو وہیں سپاہی ملتے ہیں ریحانہ تو بھی گھونگھٹ کر لے۔ بھیا سیدھے بیٹھو۔ کشتی میں کود تے نہ پھرو" بھیا ہنستا ہوا ذرا دور چلا گیا۔ لیکن ریحانہ کچھ ایسے خیالات میں محو تھی کہ اس نے سنا بھی نہیں کہ اس کی بوڑھی چچی نے کیا کہا۔

جمنا کا نرمل جل جمنا کی نیلی دھار پر زور سے گر رہا تھا۔ اور بڑی سریلی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ کشتی یہیں ٹھہر گئی۔ سیکڑوں یاتریوں کی آواز سے ریحانہ کی محویت جاتی رہی جب کشتی دور سے دریائے جمنا میں چل رہی تھی۔ تو یہ یاتری تصویروں کی طرح خوشنما معلوم ہوتے تھے۔ لیکن قریب پہنچنے پر ان کی چیخ پکار اور حرکات و سکنات نے ثابت کر دیا کہ یہ وہ تصویریں نہیں ہیں۔ بلکہ جیتے جاگتے انسان ہیں۔ اب ان کی وہ خوبصورتی جاتی رہی۔ کتنا ہجوم تھا۔ اشنان کی جگہ پانی بالکل گدلا ہو گیا تھا۔ لیکن یاتری بڑی شردھا اور بھگتی سے غوطے لگاتے تھے۔ زور زور سے منتر پڑھے جا رہے تھے اور دریا میں دودھ اور پھول پھینکے جا رہے تھے۔ ریحانہ ایک چھوٹے سے شہر کی رہنے والی لڑکی تھی وہ اردو فارسی کافی پڑھی ہوئی تھی اُسے یہ جگہ بہت خوبصورت معلوم ہوئی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کچھ اشعار پڑھے اس کا دل چاہتا تھا کہ یہیں ٹھہر جائے اور اس غل اور شور مچانے

والے مجمع سے کچھ فاصلہ پر دریا کے کنارے جو جھونپڑے پڑے تھے ان میں رہنے لگے۔ تاکہ وہ روزانہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے آتے ہوئے یاتریوں کو دیکھ سکے۔ دریا کی موجوں کا گانا سنتی رہے۔ اور دریا کے دوسرے کنارے کے سین کا نظارہ کرتی رہے۔

بوڑھی عورت دوسری بیواؤں کے ساتھ کشتی میں سے اتری اور اشنان کا ارادہ کیا۔ ریحانہ نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ وہ کشتی سے نہ اترے گی اس پر اس کے ساتھ والی عورتیں ناراض بھی ہوئیں تھیں وہ بھائی کے ساتھ کشتی میں بیٹھی رہی۔ بھائی کشتی میں سے جھکا ہوا پانی سے کھیل رہا تھا۔ لیکن یکایک چند فٹ کے فاصلہ پر ایک بڑے کچھوے کا سر دکھائی دیا۔ لڑکا ڈر کر چلانے لگا۔ بہن نے اس کو تسلی دی اور پھر تماشہ دیکھنے لگی۔ نہانے والوں میں زیادہ تر عورتیں تھیں اور ان میں سے بھی اکثر سن رسیدہ تھیں چند نوجوان عورتیں بھی تھیں۔ مجمع ان کی طرف گھور رہا تھا جس سے انہیں بہت بے اطمینانی ہو رہی تھی۔ پنڈے برابر شور مچاتے اور اشارے کرتے تھے۔ اور سینکڑوں ہتھکنڈوں سے یاتریوں سے رقمیں وصول کرتے تھے۔ کچھ لوگ پانی ملا ہوا دودھ بیچ رہے تھے۔ مرجھائے ہوئے پھول بھی یاتری بہت زیادہ قیمت پر خرید رہے تھے۔ تاکہ جمنا جی پر چڑھا کر مراد حاصل کریں۔ جا بجا نائی حجامتیں بنا رہے تھے انہیں بھی تیرتھ استھانوں پر خوب آمدنی ہوتی ہے۔

ایک دبلا پتلا بڈھا جس کا سر گھٹا ہوا تھا ریحانہ کی کشتی کے قریب آیا اس کے ساتھ چند موٹے تازے پنڈے تھے۔ وہ اس لئے آیا تھا کہ اپنے کسی عزیز کے پھول گنگا جی کے سپرد کردے۔ ہڈیوں کے ساتھ کچھ سونے چاندی کے سکے بھی تھے۔ پنڈوں میں آپس میں جھگڑا ہونے لگا ریحانہ کو یہ بہت برا معلوم ہوا اور اس نے اپنا منہ کسی دوسری طرف پھیر لیا یکایک بھائی نے چلا کر کہا "دیکھو بہن اس کشتی میں کیسی اچھی گڑیا لئے ہوئے وہ آدمی سے پیسے مانگ رہا ہے۔ ریحانہ نے اپنی ساڑھی کی گانٹھ سے ایک اٹھنی نکال کر اس کی طرف پھینکی، بھائی بڑا خوش ہوا کہنے لگا کہ تمہارا نشانہ بہت ٹھیک لگا۔ لیکن دیکھو وہ سامنے کی کشتی میں ایک بیگم بیٹھی ہے۔ اہاہا کتنے گہنے پہنے ہوئے ہے دیکھو اس نے سنیاسی کی طرف روپیہ پھینکا۔ لیکن وہ تو پانی میں گر گیا۔ تم تو دیکھتی ہی نہیں ہو دیکھو جو آدمی اس کے برابر ہے وہ اس سے ناراض ہو رہا ہے۔ لیکن ریحانہ کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کی آنکھوں کے آگے ایک سیاہ پردہ پڑ گیا اس کے کان میں گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوا کہ دریا کا پانی سیاہ ہو گیا اور اس میں بڑے زور کا طوفان آیا ہوا ہے۔ جو دنیا بھر میں پھیل جائیگا۔ بھائی ڈر کر پوچھنے لگا "آپا کیا بات ہے کیا تمہاری طبیعت خراب ہو گئی۔ کیا تمہارے سر میں درد ہو رہا ہے۔ ریحانہ جوں توں کر کے ہوش میں آئی اور پھر دیکھنے لگی۔ کشتی کچھ دور اور آگے نکل گئی لیکن سامنے کی کشتی پر ایک سبز پوش عورت جواہرات سے لدی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کا

ساتھی اندر جا چکا تھا۔ یہ عورت مسکرا رہی تھی۔

یہ وہ ساتھی تھا جس کے لئے ریحانہ نے سالہا سال سے انتظار کیا تھا۔ اس نے پہلے پہل اس خوبصورت شکل کو اس رات کو دیکھا تھا اور جب اس کی شادی ہوئی تھی اور انتظار کی حالت میں اس کے تصور نے اس شکل کو حسین سے حسین تر بنا دیا تھا۔ ہر شخص اس بات کو کہتا تھا کہ ریحانہ کیساتھ ظلم کیا گیا ہے۔ لیکن اسے یقین نہ آتا تھا وہ اپنے دل میں کہتی تھی "کہیں وہ ایسے نکھٹو ہو سکتے ہیں کہ جانتے پوچھتے مجھے چھوڑ کر چلدیں۔ میرا مقدر ہی الٹا ہے۔ اپنے شریک زندگی کا انتظار کرتی رہی۔ وہ سمجھتی تھی کہ جس طرح میری تقدیر چکر میں ہے اسی طرح وہ بھی کہیں گردش میں ہونگے۔ کبھی نہ کبھی تو آئیں گے ہی ایک دن تو ضرور آئیں گے۔ وہ امیدیں باندھتی رہی۔ اس کا نوجوان دل مایوس نہ ہونا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں اب یہ خیال گزرا کہ کیا یہ وہی ہو سکتا ہے کیا وہ مجھ سی حسین لڑکی کو چھوڑ سکتا ہے۔ اُسے یہ معلوم ہوا کہ میں خواب دیکھ رہی ہوں اور جلد ہی آنکھ کھل جائے گی۔ کشتی دور سے دور ہوتی چلی گئی اور ریحانہ کی کشتی سے بہت فاصلہ ہو گیا۔ اس کشتی میں جو عورتیں سوار تھیں ان کو یاتریوں کے ہجوم کا نظارہ کچھ پسند نہیں آیا۔ اور وہ اندر چلی گئیں مرد پھر باہر نکلا لیکن ریحانہ نے منہ پھیر لیا اُس نے اپنے گلے سے ایک سونے کی زنجیر اتاری جس میں ایک لاکٹ تھا اور اسے دریا کے نذر کر دیا یہ اسکے محبوب شوہر کی تصویر تھی۔ بے وفائی کا جواب یہ تھا کہ وفاداری کو نذرِ آب کر دیا جائے۔

خوش نصیبی

"ادھو اعجاز کتنے دنوں میں آج دکھائی دیئے ہو؟ سناؤ خیریت تو ہے"

"خدا کا شکر ہے سب خیریت ہے، اور آج تو بہت ہی خوشگوار دن گذرا ہے"

"واقعی،...... لیکن دنیا میں بہت کم ایسے خوش نصیب ہیں جو ایسا کہہ سکتے ہیں ——"

"ہاں۔ ہاں، میں کامل یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج میرا دن بہت خوشگوار گذرا ہے۔ بلکہ مجھے یہ کہنا چاہیئے کہ قسمت ایسے دن بہت کم لاتی ہے"

"واقعی تم بہت بشاش دکھائی دے رہے ہو —— آخر ہوا کیا؟ کیا کوئی لاٹری وغیرہ جیت لی ——"

"نہیں! لیکن ......!"

"ہاں ہاں کہو، میں اس بات کو سننے کے لئے بہت بے چین ہوں آخر کیا ہوا ——؟"

"کیا ہوا؟ بہت کچھ ہوا، جو تم سے ایک سانس میں نہیں کہا جا سکتا —— سب سے پہلے تو یہ سنو کہ آج میں دریا میں گرنے سے بچ گیا ——"

"معاف کرنا، میری سمجھ میں نہیں آتا ......!"

"اوہو، یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ذرا صبر کرو تاکہ میرا قصہ ختم ہو جائے آج جتنا نفیس اور دلکش دن کٹا ہے وہ عدیم النظیر ہے ــــــــ نہ تو میں آج دریا میں گرا، نہ میں نے چھٹی منزل کی کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگائی.... اور میں کسی ٹرین یا کار کے نیچے بھی دب کر نہیں مرا..........!"

"سنو تو آخر یہ کیا..........!"

"پہلے مجھے اپنی بات ختم کر لینے دو ــــــــ میرا دن بڑا خوشگوار گذرا ہے۔ کیونکہ مجھ پر ہیضہ کے جراثیم سرایت نہیں کر سکے ــــــــ نہ میں صحرا کے گرم گرم ریگستانوں میں ریت کے تودوں کے نیچے دب کر مرا، نہ سردی کے مارے شمالی قطب کی برف آلود زمین پر اکڑ کر رہ گیا ــــــــ اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ افریقہ کے ساحل پر جو جہاز آج ٹکرا کر ڈوب گیا ہے، میں اُس کے ساتھ ڈوبنے والے چھ سو مسافروں میں سے نہیں تھا۔ ذرا غور کرو کہ اُس جہاز میں چھ سو سے زیادہ مسافر تھے، چھ سو کم بخت اور بدنصیب مسافر اور میں ان لوگوں میں سے ایک نہیں ہوں۔ اور اسی طرح کتنی خوشی کی بات ہے کہ میں اُن لوگوں میں سے بھی نہ تھا جو آج چین، جرمنی اور روس کی لڑائیوں میں مارے گئے ہیں۔ اور اس بات کے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ آج مجھ سے میری بیوی محترم نے ایک بار بھی لڑنے کی زحمت گوارہ نہ فرمائی اور میرا لڑکا امتحان میں پاس ہو گیا، جس کا نتیجہ آج ہی آیا ہے۔

"یقیناً ایک خوشگوار دن گذرا ہے۔ جس میں نہ تو پولس نے مجھے سرقہ یا غبن کے الزام میں سزائے موت دی نہ کسی سی، آئی، ڈی، نے میرے "دائیں بازو" کے پروپیگنڈے کی رپورٹ انسپکٹر جنرل سے کی۔ اور یہ چیز میرے لئے کتنی خوش نصیبی کی ہے کہ محمد علی روڈ پر جو پانچ منزلہ عمارت گر گئی ہے میں اس کا مالک نہیں ہوں۔ اور میرے رہائشی مکان کو کسی نے جلاکر راکھ نہیں کیا، اور اگر کوئی اس قسم کی کوشش کرتا تو یقین ہے کہ مکان راکھ کا ڈھیر ہو جاتا تب کہیں جاکر فائر بریگیڈ کی امداد پہونچتی۔

لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بات تو خاص طور پر قابلِ ذکر یہ ہے کہ میری کوئی کہانی آج فلمائی نہیں گئی حالانکہ یورپ، امریکا اور ہندوستان میں ہزاروں اور لاکھوں تھیٹر اور سینما ہیں۔ اور ذرا غور کرو کہ کس طرح خوش قسمتی نے میرے اوپر اپنے حسین پروں کو پھیلا دیا ہے۔ ذرا سوچو تو کہ کسی شخص نے مجھے آج نگاہ اٹھاکر نہیں دیکھا، نہ میرے فرنیچر کو کسی نے خراب کیا، نہ میں غسل خانے میں مردہ پایا گیا۔ نہ سمندر میں تیرتے ہوئے میں ڈوبا ——— اور کوئی زلزلہ بھی نہ آیا جس کے گرم گرم لاوے کے ابلتے ہوئے چشموں کے نیچے میں دبا ہوا پایا گیا۔ کسی شخص نے جھگڑ کر کے میرے سینہ میں خنجر بھی نہ بھونکا، نہ کسی نے مجھے رشک اور حسد کے بے پناہ جذبہ کے تحت کوئی روحانی یا دماغی صدمہ پہنچایا، اور کسی حادثہ کا بھی میں آج شکار نہیں ہوا۔

"میرے آخری مضمون کی طباعت میں کسی قسم کی غلطی کاتب نے نہیں کی، اور ٹیلیفون کی گھنٹی ایکبار بھی نہ بجی، نہ مجھے اپنی حماقتوں کی بنا پر پاگل خانہ لے جایا گیا ——— میری والدہ نے بھی مجھے آج کوئی بددعا نہیں دی ——— اور میرے بچے حسبِ معمول میرا کہنا مانتے رہے، میرے جوتے اور موزے بارش ہو جانیکے باوجود بھی نہ بھیگے ——— اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ دنیا میں آج کے دن قیامت نہیں آئی، اور نہ اُس کی آمد کا کوئی شائبہ پیدا ہوا، جو عرصۂ دراز سے لوگوں کے دلوں میں وہشت ناک ہیبت جمائے ہوئے ہے، اب تم اس عدیم المثال دن کی خوشگواری کے متعلق کیا کہہ سکتے ہو؟ ایسا خوش نصیب دن جس ....!"

"میرا خیال ہے کہ تم آج اسی خوشی میں جشن مناؤ اور ایک گلاس برانڈی پر اپنے رات کے کھانے کو ختم کرو۔ اور میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ یہ پروگرام میرے مکان پر قبول کرو ———"

کتنے مہربان ہو تم، لیکن سوچو تو جس شخص نے اتنا نفیس دن گذارا ہے وہ کس طرح تم جیسے غریب آدمی کی دعوت قبول کر سکتا ہے ——— سوچو !! .... اور پھر یہ کہ شام کا کھانا میں کس طرح کھا سکتا ہوں جبکہ صبح سے مجھے ایک لقمہ بھی میسّر نہیں آیا ...."

"آخر یہ کیوں ....؟ کیا تمہیں فرصت نہیں ملی؟"

نہیں یہ بات نہیں میرے پاس روپیہ نہیں تھا۔ دن بھر میری غریب جیبوں نے ایک پائی کی صورت بھی نہ دیکھی اور نہ میں نے کھانا کھایا لیکن آخر کون سے ہرج کی بات ہے، جو شخص اتنا خوشگوار دن گزارے تو اُس کے لئے دن بھر کھانا کھانا تقریباً غیر ضروری ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ تم ضرور میری اس رائے سے متفق ہو گے"؟

طوفان ہی طوفان!

روزنامہ کمال مراد آباد کی ایک خبر:۔

"رات کی طوفانی بارش نے قصبہ بھر میں ایک تہلکہ مچادیا۔ مسٹر رئیس کے مکان پر بجلی گر گئی، اور خود رئیس بھی زخمی ہو گئے۔ ایک ہمسایہ لڑکی نے جو اُس وقت مسٹر رئیس کے گھر میں موجود تھی اس غیر معمولی اور اہم حادثہ کی نزاکت کو اُس وقت محسوس کیا، جبکہ خود اس کے سر کے بال کافی مقدار میں نچ کر ایک گچھا زمین پر آگرا۔ بجلی کی کڑک نے ایک قدِ آدم آئینہ اور کئی چینی کے آرائشی ظروف کو سخت نقصان پہنچادیا۔ بادل کی ہیبت ناک گڑگڑاہٹ نے اس مکان کے رہنے والوں کو اس بری طرح خوفزدہ کر دیا کہ سب اپنے لباسِ شب خوابی ہی میں گھبرا کر نیچے اتر آئے۔ اور مسٹر رئیس کے مکان کے بالائی حصّہ کو دیکھ کر پریشان اور سراسیمہ ہو گئے جس کے متعلق اُن کا قیاس تھا کہ وہ کسی لمحہ بھی منہدم ہو جانے کے خطرہ سے دور نہیں ——— سب سے تعجب خیز اور حیرت ناک بات یہ رہی کہ انیسہ۔ رئیس کی بیوی بھی وہیں موجود تھیں لیکن اُن کے ذرا بھی خراش نہ آئی ———!"

صداقت اور حقیقت کا ازلی حامی ہونے کی صورت میں کم از کم

میرا تو یہ اوّلین فرض ہے کہ اوپر درج کی ہوئی خبر کو جو عین عید کے مبارک روز شائع ہوئی تھی سچائی کی روشنی میں آپ کے سامنے پیش کردوں۔

فی الواقعہ بجلی رئیس صاحب کے مکان پر گری ہی نہ تھی، بلکہ یہہ کوئی اور چیز تھی جو اس وقت طوفان انگیز ہواؤں اور بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج کے ساتھ اپنی عجیب ہی شکل میں رئیس کے مکان پر قہر کی طرح نازل ہوئی۔

عید کی شب کو رئیس اپنے مکان پر تنہا تھے۔ اُن کی زوجہ محترمہ اپنی کسی سہیلی کے مکان پر آنے والی مسرت خیز صبح کا خیر مقدم کرنے کے لئے برج کھیلنے چلی گئی تھیں۔ اور اُن کی واپسی ٹھیک گیارہ بج کر پندرہ منٹ تک متوقع تھی۔ کچھہ تو تنہائی میں وقت کاٹنے کا خیال، اور کچھہ لوگوں کی سڑکوں پر مقصد اور بے مقصد چہل پہل کا منظر دیکھنے کے لئے رئیس نے بند کھڑکیوں میں سے ایک کو کھول کر سڑک پر نظریں دوڑائیں۔ انہیں یہ دیکھہ کر کچھہ امنگ سی پیدا ہوئی کہ بجلی کی چمک اور بادل کی پرشور آواز کے ساتھ ایک لطیف ترنم ہو رہا ہے۔ بارش کافی ہو چکی تھی، اور اب صرف بجلی اور بادل اپنے اپنے فرائض انتہائی دیانت داری کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔

یکایک صدر دروازہ سے ملاقاتی گھنٹی کی آواز آئی اور رئیس نیچے پہونچ گئے تاکہ آنے والے کا خیر مقدم کریں۔

آنے والی ایک جوان العمر عورت تھی — وہ ہانپتی ہوئی

کچھ اِس بے اطمینانی کے ساتھ اندر داخل ہوئی کہ متعدد بار اُس کے پاؤں رئیس کے پاؤں سے ٹکرا کر کافی بدمذاقی کا ثبوت دینے لگے ـــــ اُس کی آواز میں نقاہت، خوف اور کپکپاہٹ تھی۔ یکایک وہ بیدم ہو کر چلّائی:۔

"او خدا، او خدا، خدایا ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ میں یہاں دیر تک نہیں ٹھہر سکتی...... کیا تمہاری بیوی اندر ہیں؟"

رئیس اس کے ساتھ کمال ہمدردی سے پیش آیا۔ وہ بالکل جوان عورت تھی۔ رعنائیوں میں ڈوبی ہوئی...... لیکن خوف و ہراس کے مارے اُس کا چہرہ لاش کی مانند زرد تھا۔ کالا سلیپر اور آسمانی لباسِ شب، سر ایک رومال سے بندھا ہوا۔ اس کی یہ وضع قطع دیکھ کر رئیس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ قریب ہی کے کسی مکان میں رہتی ہے۔

"ہاں" رئیس نے انتہائی صفائی سے جواب دیا "انیسہ گھر پر نہیں ہیں ـــــ کیا آپ صبح تشریف نہیں لا سکتیں؟"

دو چمکیلے موٹے موٹے آنسو اُس کے زرد رخساروں پر سے بہتے ہوئے بے اختیار زمین پر گر پڑے۔ اور اس نے اپنے بازوؤں کو پھیلاتے ہوئے چیخ مار کر کہا:۔

"او خدا ـــــ اُف...... مجھے بجلی سے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ خدارا مجھے یہاں کچھ دیر کے لئے ٹھہر جانے دو۔ خدا، خدایا...... اُف۔

میں........!

بجلی پھر تڑپ کر چمکی اور ناگن کی طرح دور دور تک لہراتی ہوئی چلی گئی۔ ایک مہیب آواز نے فضا کو متزلزل کر دیا ——— اس موقع پر آنیوالی خاتون نے رئیس کو بے ساختہ پیچھے ہٹا دیا' اور دروازہ لگا کر ایک دم خوف کے مارے رئیس سے چمٹ گئی۔ وہ سردی کی راتوں میں ایک مفلس مزدور کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"آئیے۔ آئیے"۔ رئیس نے خود کو سنبھالتے ہوئے خاتون سے کہا۔ "دیکھئے ذرا خود کو خاموش کیجئے۔ طبیعت کو سنبھالئے .... آئیے۔ اندر آجائیے اور کچھ دیر کرسی پر بیٹھ کر آرام فرمائیے"؟

"میرے محسن' مہربان"۔ جوان عورت نے پھر کراہتے ہوئے کہا اور گرفت کو مضبوط کر لیا۔ کچھ دور چل کر وہ صوفے پر دراز ہو گئی۔ اور رئیس کو بھی پاس بٹھا لیا۔ اس کے پھیپھڑے اتنی زور سے کانپ رہے تھے کہ سینے کی دھڑکن صاف نمایاں تھی۔

خدا کے واسطے ——— مسٹر رئیس ——— کچھ دیر تک اپنے گرم ہاتھوں کو میرے ہاتھوں میں رہنے دیجئے۔ اور چند لمحے مجھے یہیں ٹھہرا رہنے دیجئے"۔

"آپ یقیناً یہاں ٹھہر سکتی ہیں"۔ رئیس نے اُسے دلاسا دیا اور وہ دونوں اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔

بارش پھر اپنے شباب پر آگئی ——— سڑکوں پر نالے اور پرنالے بہہ رہے تھے۔ بجلی ہر لمحہ چمک رہی تھی۔ طوفانی ہواؤں کے زور سے کھڑکیاں آپس میں شدت کے ساتھ ٹکرا رہی تھیں۔ ہر لمحہ خوفزدہ خاتون رئیس کے قریب ہوتی جاتی تھی' اور اپنے ہاتھوں کی گرفت کو برابر مضبوط کئے جا رہی تھی' رئیس بھی آخر انسان تھا' وہ بھی موقع کی نزاکت سے پوری طرح لطف اندوز ہونے لگا.......... اور وقت تیزی کے ساتھ گزرتا چلا گیا۔

یکایک گھڑی نے گیارہ بجائے۔ رئیس چونکنا ہو گیا اور گھنٹوں کی آواز کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر ایسے آثار نمودار ہونے لگے جن سے پریشانی اور گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر انیسہ اُسے ایک غیر عورت کے ساتھ اس عالم میں دیکھ لے گی تو کیا ہوگا......؟؟ اور ایسے موقع پر جبکہ آنے والی خاتون لباس شب خوابی میں ملبوس ہے اور یہ خیال کہ انیسہ پانی اور بجلی کی وجہ سے شاید دیر سے آئی قطعاً غلط تھا کیونکہ اس کی وقت کی پابندی ایک مشہور عادت تھی۔

اس نے اپنا گلا صاف کیا اور کچھ کہنے کی کوشش کی:۔

"میرا خیال ہے کہ طوفان میں اب وہ شدت نہیں رہی۔ اور رات بھی کافی گذر چکی ہے........"

"نہیں نہیں ———" خاتون نے پریشان ہو کر کہا "سنو سنو! "اب تو فضا بھی صاف ہو چکی ہے........ اور طوفان کا

شائبہ بھی نہیں"۔ رئیس نے کھوئی ہوئی نظروں سے بائیں طرف گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا جس میں گیارہ بج کر پانچ منٹ ہو چکے تھے۔

"نہیں نہیں۔ ابھی تک طوفان کا اثر باقی ہے"۔ اُس نے چلا کر کہا اور پھر وہی تھرتھراہٹ اُس کے تمام جسم سے نمودار ہونا شروع ہو گئی۔

رئیس کو اختلاجی کیفیت نے آدبوچا سخت پشیمانی اور اضطراب کے عالم میں وہ اپنی بیوی کی پابندیٔ وقت کے بابت بسرعت سوچ چلا جا رہا تھا ——

اب تو طوفان کا نام بھی نہیں ہے"۔ بوکھلائے ہوئے رئیس نے کسی قدر تیز آواز میں کہا۔ اور اپنا ہاتھ اُس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔

"نہیں۔ نہیں۔!!" اُس کی ہمسایہ عورت نے انتہائی خوفناک طریقہ پر اپنے سر کو ہلاتے ہوئے کہا۔ اور ساتھ ہی اپنے ہاتھوں کی گرفت کو مضبوط کر دیا۔ رئیس اضطرابی، اور اضطراری کیفیت کے سمندر میں ڈوب گیا —— اس کا چہرہ پسینہ سے شرابور ہو رہا تھا —— پریشان اور حیران نظر گھڑی پر تھی۔ اور ایک عجیب ہراس کا عالم اُس پر طاری تھا۔ گیارہ بج کر دس۔ گیارہ بج کر بارہ، ...... اور پھر گیارہ بج کر تیرہ.... آخر کار جب گھڑی کی دونوں سوئیوں نے گیارہ بج کر چودہ منٹ کا متحد ہو کر اعلان کیا تو رئیس کے حواس باختہ ہو گئے ——

اور اسی عالم میں ایک بے حد خطرناک بجلی چمکی۔ بجلی کی چمک کے ساتھ جو کڑک تھی وہ غیر معمولی طور پر کانوں کو بہرہ کر دینے کے لئے کافی تھی کھڑکیاں آپس میں ٹکرائیں اور بالائی منزل کانپنے لگی —— اجنبی خاتون خوف کے مارے کانپ گئی اور اُس نے اپنے دونوں ہاتھ رئیس کی گردن میں حمائل کر کے اپنے سر کو اس کے سینے میں چھپانے کی کوشش کی اور بے طرح کراہنے لگی —— "او خدا۔ خدایا........!!"

گھڑی نے فوراً ہی سوا گیارہ کی جانب اشارہ کیا۔ تالے میں چابی لگنے کی آواز آئی —— دروازہ کھلا —— اور انیسہ کمرے میں داخل ہو کر دہلیز پر ہی اپنی ایڑیوں کے بل کھڑی ہو گئی —— کوئی تیس سیکنڈ تک اُس نے اس منظر کو بغور ملاحظہ فرمایا —— پھر اپنا ہینڈ بیگ کرسی پر پھینک کر دونوں ہاتھوں کو اپنی کمر پر رکھ لیا... اس وقت اس کی زبان سے صرف ایک لفظ نکلا:۔

"اخّاہ!!" ——

ٹھیک پانچ منٹ بعد سوائے ان تین شخصیتوں کے مکان کے اور دوسرے حصّہ کے رہنے والے لوگ بے تحاشہ اپنے اپنے کمروں میں سے نکل کر سڑک پر جمع ہو کر قیاس آرائیاں کرنے لگے:۔

کسی نے کہا "رئیس کے بالائی حصے پر بجلی بڑی زور کے ساتھ گری ہے۔ اور وہ بے طرح زخمی ہو گئے ہیں"

کوئی کہہ رہا تھا "بڑی غضب کی چیخ پکار تھی"

اور کوئی انتہائی رازدارانہ لہجہ میں کھسر پھسر کر رہا تھا کہ "اس شور اور غل کے ساتھ تمام گھر گونج رہا ہے کہ مکان کسی ساعت بھی منہدم ہو سکتا ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

یہ سچ ہے کہ بالائی منزل پر جو کچھ ہوا، اُس کی خالص ذمہ داری طوفان پر ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ بجلی گر پڑی اور اُس کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا سخت غلط ہے۔ وہ بجلی نہیں تھی بلکہ انیسہ کی آمد تھی اور ایسے موقع پر آمد کے نتائج ——————

مسٹر رئیس کا مُنہ ابھی تک سفید پلاسٹر سے بھرا ہوا ہے اور وہ اجنبی خاتون ابھی تک اپنے بالوں کے ایک بڑے گچھے کے نوچ جانے پر ماتم کر رہی ہے۔

طوفان کی شدّت نے رئیس کی ہمسایہ دوشیزہ کے جذباتِ عشق میں اس درجہ ہیجان برپا کر دیا کہ وہ رئیس کے مکان میں نتائج کا لحاظ کئے بغیر چلی آئی —— طوفان، بجلی اور بادل کے لرزہ خیز ہنگامے نے ہی انیسہ کو یہ موقع دیا کہ وہ کھڑکیاں، گلدان، شیشے، چینی کے برتن، الماریاں ایک آہنی ہتھوڑے سے توڑ پھوڑ ڈالے اور طوفان سے اپنی وکالت کرا سکے —— طوفان ہی نے تینوں کی لاج رکھ لی۔ اور اخبار کے لئے ایک بڑے زمیندار اور انگلینڈ ریٹرن بیرسٹر کی مصیبت سے ہمدردی کا بہانہ مہیا کر دیا —— قدرتی طوفان اور جذبات کا طوفان ——

جنگ کا قانون

ایک برطانوی گورا سپاہی بازارِ حُسن کی تلاش میں شراب پیئے بدمست سفید گلی کے نکڑ پر چلا جا رہا تھا۔ بجلی کی روشنی میں غازہ اور.... لپ اسٹک تھپے ہوئے ہر فروخت ہونے والے چہرے کی جانب وہ دیکھتا اور آگے بڑھ جاتا ——————

وہ بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ کسبیوں کے محلہ سے گذر کر وہ عام شہری آبادی میں جا گھسا۔ اُسے اپنے تن بدن کا ہوش ہی کب تھا ——————
نہ اُس نے اُس نوٹس بورڈ کی ہدایت پر کوئی نوٹس لیا جس پر الفاظ لکھے رہتے ہیں (OUT OF BOUND) —————— اس کی نگاہ اُٹھی ایک نوخیز کالی ساری میں ملبوس حسینہ کمرے کی بالکنی میں کھڑی بے پرواہ نگاہوں سے سڑک کو دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ اپنے شوہر کے ساتھ ابھی ابھی سینما کا شو دیکھکر واپس ہوئی تھی —————— گورا حسینہ کو اپنا مرکزِ نگاہ سمجھ کر زینہ پر چڑھ گیا اور اس نے فلیٹ کا دروازہ کھٹ کھٹایا۔ دروازہ کھولنے والی خود حسینہ ہی تھی ——————

صاف شفاف انگریزی میں اس نے پوچھا "کس کی تلاش ہے"
"ڈارلنگ، تمہاری ہی تو تلاش ہے —————— ......"
اس کی زبان لتھڑائی ہوئی تھی اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا

لیکن کمرے میں گھسکر حسینہ سے لپٹ گیا ——————

ساری عمارت میں شور مچ گیا ایک غل غپاڑہ ——— بیسیوں آس پاس والے جمع ہوگئے ——— مگر گورا دس بیس جیب میں سے نوٹ نکالے برابر اس کی خواہش کر رہا تھا کہ اُسے اپنا مقصد حاصل کرنے دیا جائے ——————

وہ کیا چاہتا تھا؟ کس حالت میں تھا' یہ سب سمجھ رہے تھے۔— ——— بعض کے لبوں پر ایک تبسم تھا جس سے غلامی کی بے بسی کا ماتمی سوگ صاف نمایاں ہوتا تھا' بعض اُسے دھکا دے کر نیچے پھینک دینا چاہتے تھے ان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا ——————

دس منٹ اسی طرح گذر گئے آخر کار ایک پولس کانسٹبل آیا۔ اور ہاتھ پکڑ کر گورے سپاہی کو لے گیا ——————

دوسرے دن سکریٹریٹ کے اکاؤنٹنٹ نے اپنی توہین اور بیوی کی عصمت کے خلاف حملہ کے الزام میں جب گورے کے نمبر داخل کر کے پولس میں شکایت کی تو جواب ملا کہ ملٹری کے ذمہ داروں کی جانب سے جواب آجانے دو۔ کارروائی کی جائے گی ——————

———*———

ناکامی کے بعد

گرین ہوٹل میں جہاں اب ہندوستانی بھی آنے جانے لگے ہیں۔
چائے پیتے ہوئے اس نے مینا سے شادی کی درخواست کرنی چاہی۔
"مینا، میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" اس کی انگلیوں نے غیر معمولی قوت کے ساتھ پیالی کا کندا پکڑ رکھا تھا اور اس کی آنکھیں سامنے سنگِ مر مر کی میز پر جم گئی تھیں۔

"کیا بات ہے اشوک؟ کہو۔" اسے تعجب ہو رہا تھا کہ آخر وہ اتنا بدحواس کیوں ہو گیا ہے۔

"مینا، میں تم سے کہنا چاہتا ہوں۔ یعنی بات صرف اتنی سی ہے کہ ...... مجھے ملازمت مل گئی۔"

"لیکن میں نے کب کہا تھا کہ تمہیں ملازمت مل جائیگی تو میں ....."

"کیا کہا ———؟ تم نے!"

"میں نے! ———"

وہ یہ سوچنے لگی کہ اشوک سے یہ کیسے کہے کہ اُس نے اپنی ماں کے کہنے سے رام رتن ورما، ورما ملز کا مالک اور شہر کے بہت بڑے سرمایہ دار کے بیٹے سے شادی کرنا منظور کر لیا ہے ——— اس لئے اس نے طے کیا کہ اشوک کو باتوں میں بہلائے۔ بہت سوچ کر خاموش اشوک کی

طرف اُس نے دیکھا۔

"کونسی ملازمت ہے ——— ؟"

"سکریٹریٹ کی کلرکی ——— تنخواہ اسّی روپیہ"۔ مشتبہ لہجہ میں اشوک نے کہا۔

"میں تمہاری دوست ہوں، کلرک بننا مجھے نہیں بھاتا۔ اس لئے ———"

"اس لئے کیا کروں ———" بیتابی سے اشوک نے پوچھا۔

"کاروبار کرو ——— اور روپیہ کماؤ"۔

"کاروبار اور روپیہ ———!" وہ حیرت زدہ ہو رہا تھا کیونکہ محبت میں نوکری، کاروبار اور روپیہ کا کیا تذکرہ۔ عشق کو غمِ روزگار سے کیا تعلق؟

بھاری دل کے ساتھ وہ گھر آیا اور دوستوں کو جو محبّت کے رازدار تھے اس نے خبر دی کہ مینا نے ملازمت کی خبر پر یہ تاثرات ظاہر کئے ہیں ——— رازداروں میں سے بعض نے دلچسپی سے بعض نے ہمدردی سے اس کی باتیں سنیں۔ اور سب اپنے اپنے کام سے لگ گئے۔

دوسرے دن صبح وہ گھر سے باہر جانا چاہتا تھا یہ سوچ کر کہ ملازمت سے استعفےٰ دیدے اور کاروبار کے متعلق غور کرے۔ مگر وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ باپ نے آواز دی۔

"اشوک! یہاں آؤ ـــــــ"

اس کا باپ بھی سکر ٹریٹ کا پرانا کلرک اور آج کل آفس سپرنٹنڈنٹ تھا۔ وہ خاموش بغیر کچھ سوچے باپ کے سامنے جاکر بیٹھ گیا ـــــــ

"اب تم نوکر ہوگئے ہو۔ اس لئے تمہاری شادی لازمی ہے۔ گنگادھر ساہوکار کی لڑکی سے تمہاری نسبت ہم پختہ کر چکے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"جی میرا خیال! ـــــــ" بے خیالی میں اشوک نے پوچھا۔

"ہاں ـــــــ گنگادھر لاکھوں کے آدمی ہیں........ فلاں بیمہ کمپنی کے ڈائرکٹر مگر ہم سے ان کی بہت دوستی ہے۔ ہم نے ان کے بڑے بڑے سرکاری کام نکالے ہیں۔ اس لئے وہ ہماری بات مان گئے۔"

"لاکھوں کے آدمی ہیں ـــــــ" اشوک نے دہرایا "تو اُن سے مجھے دس ہزار روپیہ دلوا دیجئے میں کاروبار کروں گا۔ مجھے نوکری پسند نہیں۔

گنگادھر اور اشوک کے باپ میں اشوک کے کاروبار کا معاملہ طے ہوگیا۔ مہینہ بھر کے اندر اشوک بمبئی کے کاٹن مارکیٹ میں کاروباری کی حیثیت سے داخل ہوا قسمت نے یاوری کی اور چھ ماہ کے بعد وہ سیٹھ اشوک مشہور ہوگیا۔ اب لاکھوں کا کاروبار اُس کے بائیں ہاتھ کا کام ہوگیا آخر اُس نے ایک دن موقع پاکر مینا سے کہا۔

"اب میں کاروبار میں ترقی کر کے بہت اونچے درجے پر پہنچ گیا ہوں ...." مگر وہ یہ پھر بھی نہ کہہ سکا کہ مجھ سے شادی کر لو۔ اور مینا نے جواب دیا۔

"مجھے بڑی مسرت ہے۔ اب میں بھی اپنے ماں باپ سے علیحدہ اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہوں —— کلابے میں کل چار بجے آئیے ......"

وہ اپنے کہنے کے اثرات دیکھنا چاہتی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ یہ بات اشوک کے دل و دماغ پر ایک بم کی طرح پھٹے گی —— واقعی ایسا ہی ہوا —— اشوک ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے چہرہ پر بہت سے رنگ آئے گئے لیکن وہ خاموش رہا —— بہت دیر خاموش رہا۔ اور مینا کچھ انفعال اور کچھ دل چسپی سے اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھتی رہی۔ خاموشی ناگوار ہو چلی تھی۔ اس لئے معصوم نگاہی کو کام میں لاکر مینا نے کہا —— "کیوں آپ اس درجہ خاموش اور متفکر کیوں ہو گئے کیا طبیعت ناساز ہے ——" اس کے لب و لہجہ میں گہرا طنز اور معذرت دونوں چیزیں موجود تھیں۔

اشوک نے نگاہ بھر کر مینا کو دیکھا وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ کھیل ختم ہو چکا ہے اور اُسے احمق بنایا گیا ہے۔ اگرچہ مینا نے کبھی اُس سے محبت کا اقرار نہ کیا تھا اگرچہ اُن میں کبھی شادی کا تذکرہ نہ ہوا تھا۔ مگر اس نے سوچا کہ کالج کے زمانے سے لے کر چند ماہ پہلے تک اتنی یگانگت، اتنی قربت اتنی سنگت اور اُس کی باتیں کیا کسی چیز سے مینا نے یہ نہیں سمجھا کہ وہ

کیا چاہتا ہے ______

اُسے یقین نہ ہوا اور اس نے کچھ ہکلاتے ہوئے ان الفاظ کو صاف ادا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے جو حلق میں اٹک رہے تھے کہا ______

"میں یہ سوچ رہا تھا کہ تم نے مجھے بالکل غیر سمجھا! یا شاید اس کا بدلہ لیا کہ میں نے اپنی منگنی میں تمہیں مدعو نہیں کیا ______"

اب اشوک کی باری تھی وہ اپنے الفاظ کا اثر دیکھنا چاہتا تھا۔ توقع کے مطابق اس نے دیکھا کہ مینا پر "منگنی" کے الفاظ سے بجلی سی گر پڑی وہ صرف یہ کہہ سکی کہ "منگنی کیسی!"

"منگنی، منگنی کی طرح ______ ساہوکار گنگا دھر کی بیٹی راج کنول سے"......

"راج کنول سے"! مینا کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ راج کنول اُس کی دوست اور سہیلی تھی۔ کالج کی ساتھی۔ کلاس میں دونوں ساتھ تھیں اور کالج کی حسین لڑکیوں میں ایک دوسرے کا جواب ------ وہ یہ سمجھی کہ اشوک اُسے بیوقوف بنانا چاہتا ہے ______

"مگر راج کنول کی نسبت تو دوسری جگہ ہو رہی تھی ______"

مینا نے کہا ______

"ہاں! میری نسبت بھی دوسری جگہ ہو رہی تھی۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ تم تو میری شادی میں آؤ گی نا ـــــــ ایک مہینے کے بعد ـــــ"

"ضرور! ـــــــ"

ـــــــ مگر مینا راج کنول کی شادی میں نہیں آئی۔ اور اشوک نے اُسے اور اس کے شوہر کو کوئی باقاعدہ دعوت نامہ بھی نہیں بھیجا۔ راج کنول اور اشوک کی شادی ہو گئی ـــــــ

مینا کی شادی مل مالک کے بیٹے سے ناکام رہی وہ عیاش طبع نوجوان اور شرابی تھا۔ راج کنول سوسائٹی کا کنول بن گئی۔ اشوک اور راج کنول مینا کے لئے ایک روحانی عذاب بن گئے۔ دو سال گذرنے کے بعد مینا نے جو بہت سے روحانی اور ذہنی نشیب و فراز سے گذر چکی تھی اشوک سے ایک خاص ملاقات میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا مگر اشوک کو اب مینا سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

عنقریب آپ کی خدمت میں

بہترین لٹریچر مکتبہ ادب دہلی

پیش کر رہا ہے